سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ ترجمان القرآن

[redacted]

[redacted]

ماہنامہ
ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۲ جون ۱۹۹۶ محرم الحرام ۱۴۱۷ عدد ۶

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ ' ملتان روڈ ' لاہور ۵۴۵۷۰
فون: ۷۵۷۰۱۲۴
فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵- اے ذیلدار پارک ' اچھرہ ' لاہور
فون: ۷۵۸۵۵۹۰ - ۷۵۸۷۹۱۶

☆

قیمت فی شارہ -/۱۵ روپے
زر سالانہ -/۱۵۰ روپے
مشرق وسطی -/۵۵۰ روپے
بنگلہ دیش ' مسقط -/۴۵۰ روپے
بھارت -/۳۰۰ روپے
یورپ ' مشرق بعید -/۶۵۰ روپے
امریکہ ' کینیڈا ' آسٹریلیا -/۹۰۰ روپے

○

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

قرآن مجید کے اصول جس زمانہ میں تعلیم کیے گئے وہ ایسا زمانہ تھا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا متحارب قوموں، فرقوں اور طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اس حالت میں قرآن نے انتہائی بین الاقوامیت کی تعلیم دے کر ایک بالکل نئی چیز دنیا کے سامنے پیش کی۔ یہ ایک غایت درجہ کا بے باکانہ اقدام تھا، مگر یہ اس قسم کے اقدامات میں سے تھا جن کا اظہار قرآن مجید نے اپنے دوسرے اصولوں کی تعلیم میں کیا ہے۔ بلاشبہ قرآن اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان طبقات میں منقسم ہیں اور درجات کی کمی و بیشی حق بجانب ہے تا کہ شخصی قابلیتوں کو آزمائش کا پورا موقع مل سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قطعیت کے ساتھ کہتا ہے کہ فرقوں اور باہم جنگ کرنے والے عناصر کا وجود دراصل قانون الٰہی سے انحراف اور تجاوز کر جانے کی سزا ہے۔ جتنے شعوب و قبائل دنیا میں موجود ہیں، اپنی طبیعی اصل کے اعتبار سے یکساں ہیں، اور ان کے امتیازی خصائص کا بقا صرف اس غرض کے لیے درست ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان تمیز ہو سکے۔ باقی رہی فضیلت اور شرافت و بزرگی تو قرآن صاف کہتا ہے کہ وہ کسی نسل، کسی قبیلے، کسی خاندان اور کسی قوم سے تعلق رکھنے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اعلیٰ سیرت اور نیک کردار کی بنا پر ہے۔ جس شخص نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی ایک غلام سے کر دی، جو شخص ایک غلام زادے کو اشراف قریش کی فوج کا سپہ سالار بنا سکتا تھا، جو شخص اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں اپنی قوم کے ایک نہایت غریب آدمی کی سی زندگی بسر کر سکتا تھا، جس کے دل میں کمزوروں اور پست حال لوگوں کی بھلائی کے سوا کوئی اور خیال نہ تھا، ایسے شخص کا طرز عمل خود ہی پرانی حد بندیوں کی شکست کا ایک زندہ نمونہ تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ بین الاقوامی تخیل کے حامیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نسل، زبان اور جغرافی تقسیموں کی بظاہر ناقابل عبور حد بندیاں ہیں اور تخیلات خواہ کتنے ہی مقدس ہوں، مگر انسان اپنے روز افزوں ذرائع کے باوجود آج تک ان رکاوٹوں پر غالب آنے اور ان تصورات کو حقیقت بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے جن کا اشتہار ''انسان کی پارلیمنٹ اور عالم گیر وفاق'' کے دل خوش کن عنوانات سے وہ بڑے زور شور کے ساتھ دے رہا ہے لیکن پیغمبر اسلام نے نوع انسانی کو ایک راستہ دکھایا، قانون کلی کا راستہ، جس کو نسل، وطن، زبان اور جغرافی اشکال کی تمام شدید حد بندیوں کے باوجود تمام انسان قبول کر سکتے ہیں، اور آپ نے خود روم، حبش، فارس اور عرب کے لوگوں کو اس قانون کی اطاعت میں جمع کر کے نہ صرف ایک بلند تخیل پیش کیا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنا کر بھی دکھا دیا، جس کی نظیر آج تک کوئی دوسرا انسان پیش نہ کر سکا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(پروفیسر ہارون خان شیروانی، قرآنی نظریہ سلطنت، جلد ۸، عدد ۴، ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ، جون ۱۹۳۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

لبنان: شہنشاہ اور قزاق کی کہانی

خرم مراد

سینٹ آگسٹائن (م: ۴۳۰) کا مقام عیسائیوں کے ہاں وہی ہے جو ہمارے ہاں غزالی' ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا۔ وہ ایک دلچسپ کہانی سناتے ہیں: ایک بحری قزاق کو پکڑ کے سکندر اعظم کے سامنے لایا گیا۔ سکندر نے اس سے پوچھا کہ تم سمندروں میں اتنے دھڑلے سے کیسے ڈاکا زنی کرتے پھرتے ہو؟ اس نے جواب دیا: حضور' آپ ساری دنیا میں بڑے دھڑلے سے ڈاکے مارتے پھر رہے ہیں! فرق صرف اتنا ہے کہ میں یہ کام ایک چھوٹے سے جہاز سے کرتا ہوں' اس لیے میں ڈاکو کہلاتا ہوں' حضور یہی کام ایک عظیم فوج اور بحری بیڑے کے ذریعے عالمی پیمانے پر انجام دیتے ہیں' اس لیے آپ کو شہنشاہ کہا جاتا ہے۔

اپنے ہاں تو ہم برابر یہی ڈراما ہوتا دیکھتے آرہے ہیں کہ ایک جنرل فوج کے بل پر ہمارے ملک پر قبضہ جما لیتا ہے' کچھ اور لوگ ہیں جو دونوں ہاتھوں سے قومی خزانہ لوٹتے رہتے ہیں' ان سب کو نجات دہندہ' وزیر اور افسر ہونے کا اعزاز و احترام بخشا جاتا ہے۔ ایک آدمی ایک کلاشنکوف لے کر ایک گھر کو لوٹ لیتا ہے' اس کو ڈاکو کا لقب دے کر اس سے نفرت کی جاتی ہے۔ لیکن بساط عالم پر' چھوٹے موٹے "دہشت گردوں" کے خلاف کارروائی کے نام پر' "شہنشاہ" امریکہ اور اس کے "کارندے" اسرائیل نے عرصے سے جو دہشت گردی مچا رکھی ہے' اس پر تو یہ کہانی بالکل ٹھیک صادق آتی ہے۔ اتنے فرق کے ساتھ ضرور کہ یہ چھوٹے چھوٹے "دہشت گرد" بھی' بالعموم' شوق قزاقی میں نہیں بلکہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق شہنشاہ کے ظلم کے خلاف ایسی کارروائیاں کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جو قتل و غارت گری "شہنشاہ" یا ان کے اہالی و موالی خود کریں اور وہ بڑے پیمانے پر ہو' کتنی ہی ہولناک کیوں نہ ہو' نہ صرف بالکل جائز' جوابی یا دفاعی کارروائی ہوتی ہے' بلکہ مستحسن بھی ہوتی

ہے۔ اس کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا مزاج شاہی کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ دوسرے، جیسے ریڈ انڈین، فلسطینی، مسلمان، ایک راکٹ بھی پھینک دیں تو وہ، ان کا پورا ملک، عورتوں اور بچوں سمیت ان کی ساری آبادی، ان کے معاشی وسائل، سب کے سب حلال ہو جاتے ہیں، قابل گردن زدنی اور مستحق ہلاکت و بربادی۔

اس دوغلے کردار کا تازہ ترین نمونہ وہ دہشت گردی ہے جو لبنان میں حال میں اسرائیل اور امریکہ نے کی ہے۔ روزنامہ انڈی پنڈنٹ 'لندن کا نامہ نگار، رابرٹ فسک (Fisk) لکھتا ہے: "یہ تو قتل عام ہے! میں نے صبرہ و شاتیلا (۱۹۸۲) کے بعد بے گناہوں کو اس طرح ذبح ہوتے نہیں دیکھا ہے۔ جگہ جگہ عورتوں، بچوں اور مردوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کسی کے ہاتھ غائب، کسی کی ٹانگیں، کسی کا سر۔ امریکہ کے فراہم کردہ بم استعمال کیے گئے ہیں، جو زمین سے ۱۲ فٹ اوپر پھٹتے ہیں، زیادہ سے زیادہ ہلاکت پیدا کرتے ہیں اور اعضا کو کاٹ کاٹ کر جسم سے جدا کر دیتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے کمپاؤنڈ میں خون کے نالے بہہ رہے ہیں۔ ایک فرانسیسی سپاہی، ہاتھ میں تھیلا لیے، کٹے ہوئے ہاتھ، پاؤں اور انگلیاں جمع کر رہا ہے۔ شہریوں کو تو اسرائیل خوف ناک طریقے سے ذبح کر رہا ہے۔ ایک ایمبولینس کو میزائل سے تباہ کر دیا، ایک جگہ دو بہنیں، ایک جگہ ایک دو سالہ بچی، اور ایک جگہ ۱۴ افراد پر مشتمل ایک گھر، اسی طرح میزائلوں کا شکار ہو گئے" (۱۹ اپریل '۹۶)۔ یہ قانا ہے، جہاں اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر کے احاطے میں، اسرائیلی ہوائی جہاز ۶۰۰ سے زائد پناہ گزینوں کو ۱۳ منٹ تک بموں اور میزائلوں کا نشانہ بناتے رہے۔

اسرائیل نے فوراً کہا کہ "یہ قتل عام غلطی سے ہو گیا"۔ ہمارے خلاف راکٹ اس احاطہ کے پاس سے فائر کیا گیا تھا۔ حالانکہ سارا پروپیگنڈا ہی یہ تھا کہ یہ ایسے میزائل ہیں جو سرجن کے چاقو کی طرح ٹھیک اپنے نشانے پر بیٹھتے ہیں، غلطی کر ہی نہیں سکتے۔ مگر یو این والوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم نے تو دو دن قبل اسرائیل کو مطلع کر دیا تھا کہ ہمارے پاس ۵ ہزار لوگ پناہ لیے ہوئے ہیں۔ ادھر رابرٹ فسک نے وہ ویڈیو ہی حاصل کر لیا جس میں عین بم باری کے وقت اسرائیل کا نگراں و راہنما طیارہ (drone) احاطہ کے اوپر پرواز کرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ویڈیو سے اسرائیل کے جھوٹ کا پول کھل گیا اور قطعاً ثابت ہو گیا کہ یہ ہلاکت عمداً نشانہ باندھ کر کی گئی۔ (انڈی پنڈنٹ، ۴ مئی '۹۶)۔ ویڈیو کی دریافت کے بعد اسرائیل نے اپنا بیان بدل لیا: ہاں طیارہ وہاں موجود تو تھا، مگر دوسرے مقاصد کے لیے۔ یو این کے ڈچ کمانڈر نے بھی اپنی خفیہ رپورٹ میں اسرائیل کو دانستہ بم باری کے لیے مورد الزام قرار دے دیا۔ لیکن امید نہیں کہ سیکرٹری جنرل، بطروس غالی اس رپورٹ کو سیکورٹی کونسل میں پیش کریں گے، کیونکہ امریکہ سخت خفا ہے کہ تحقیقات کیوں کرائیں، اور کرائیں تو

یہ نتیجہ کیوں نکلا کہ "شہنشاہ" بھی بڑے پیمانے پر وہی کام کر رہا ہے جو ڈاکو کرتا ہے۔ امریکہ خفا ہو تو ان کے اگلے ۵ سال کی نوکری خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اس کو اصرار ہے کہ "قانا" کو بھلا دیا جائے' دفن کر دیا جائے۔ اور اسرائیل تو اب اقوام متحدہ کی فوجوں کا وجود ہی لبنان سے ختم کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھیے! کہنا پڑتا ہے کہ اچھا ہوا کہ قانا میں یہ قتل عام ہو گیا' ورنہ بے چارے لبنانیوں کی خیر نہ تھی۔ یہ اتنی بڑی "غلطی" ہو گئی کہ "شہنشاہ" نے فوراً اسرائیل کی جنگ بند کرا دینے میں ہی عافیت دیکھی۔ ورنہ ۱۰ روز سے روزانہ سیکڑوں ہوائی حملے ہو رہے تھے' دور مار توپیں بم باری کر رہی تھیں' بحری جہازوں نے ناکہ بندی کر رکھی تھی' ہر طرف سے بم' راکٹ اور میزائل برس رہے تھے۔ (۱۴ دن میں ۱۱۰۰ ہوائی حملے' ۲۳۰۰۰ شیل)' ۲۰۰ سے زیادہ لوگ ہلاک ہو چکے تھے' ۵ لاکھ کے قریب بے گھر ہو کر مارے مارے پھر رہے تھے' سرجیکل بم بیروت کے دو پاور ہاؤس تباہ کر چکے تھے۔ مگر بے شرمی کی حد یہ تھی کہ امریکہ اور برطانیہ کھل کر اسرائیل کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے: "ہر ملک کو اپنے دفاع کا حق ہے"۔ "دہشت گردی کے خلاف مناسب اور جائز ردعمل ہے"۔

کہیں سے بھی اس وحشیانہ کارروائی کی مذمت میں چوں بھی نہ ہو رہی تھی۔ لبنان کے "مسلمان عرب بھائی" چپ سادھے ہوئے تھے۔ یاسر عرفات شمعون پیریز سے معاہدہ کر کے مسکرا رہے تھے۔ لبنان نے ۱۵ اپریل کو سیکورٹی کونسل کا اجلاس بلایا' تو امریکہ نے ایسی تیوریاں چڑھائیں کہ وہ مذمت کا ایک حرف بھی پاس نہ کر سکی۔ حتیٰ کہ قانا کے قتل عام کی خبر کے بعد بھی کوئی کچھ نہ بولا۔ لبنانیوں کی جان کیسے بچتی' وہ تو قانا کے حادثے نے مجبور کر دیا کہ اسرائیل اور امریکہ اپنے منصوبے فی الحال ملتوی کر دیں اور دوڑ دھوپ کر کے' حافظ اسد کی خوشامد کر کے کسی طرح جنگ بندی کرا دیں۔ ۱۶ دن کے بعد جنگ بند ہو گئی' کم و بیش انھی شرائط پر جن پر ۱۹۹۳ کی اسرائیلی جنگ بند ہوئی تھی' اور جن شرائط کو اپنے حق میں تبدیل کرانے کے لیے ہی اسرائیل نے یہ غارت گری مچائی تھی۔

یہ حزب اللہ کی کس "دہشت گردی" کا "جائز ردعمل" اور اس کے خلاف "جائز دفاع" تھا؟ ۱۹۹۳ میں اسرائیل کے اسی قسم کے حملے کے بعد' اور تباہی مچنے کے بعد' جب امریکہ نے جنگ بند کروائی تو یہ طے پایا کہ دونوں' اپنے شہری علاقوں سے دوسرے کے شہریوں پر حملے نہیں کریں گے۔ حزب اللہ اپنے اس حق سے دست بردار نہیں ہوئی کہ وہ مقبوضہ لبنان میں اسرائیلی فوجیوں پر حملے جاری رکھے گی۔ چنانچہ "موت کے متمنی" مجاہدوں نے ایسی بے جگری سے حملے جاری رکھے کہ پتہ بھی کھڑکتا تو اسرائیلی فوجی کانپ جاتے۔ اپنے فوجیوں کی ہلاکت روکنے کے لیے اسرائیل نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شہریوں پر حملے شروع کر دیے' اور ہر حملے کو "غلطی" قرار دیتا رہا۔ حزب

اللہ نے جواب میں 'گلیلی میں قریات شمونہ پر راکٹ پھینکنا شروع کر دیے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان راکٹوں سے ایک بھی اسرائیلی ہلاک نہ ہوا تھا۔ بلکہ ۱۹۸۲ سے '۱۴ سال کی مدت میں حزب اللہ کی جوابی "دہشت گردیوں" سے صرف ۱۳ اسرائیلی ہلاک ہوئے ہیں۔ لیکن جب ایک اور فوجی ہلاک ہو گیا تو اسرائیل نے ۱۱ اپریل سے "سبق سکھانے" کا موجودہ آپریشن شروع کر دیا۔ لندن کے اکنامسٹ جیسے اسلام دشمن پرچے کو بھی کہنا پڑا "حزب اللہ کی کارروائیوں کو دہشت گردی قرار دینا تو دہشت گردی کی تعریف کو بہت زیادہ کھینچ دینا ہے۔ اول تو حزب اللہ اپنے ہی علاقے کو آزاد کرانے کے لیے حملے کر رہے تھے' اور یہ "جوابی" کارروائی تو "ایک آنکھ کے بدلے دو آنکھیں" نکال لینے کے مترادف ہے' بلکہ اس سے بھی زیادہ"۔

اسرائیلی حملے کے مقاصد فوجی نہیں' سیاسی تھے: ۱۹۹۳ کے معاہدے کی شرائط پر لڑنا (جو قانا کے واقعے کی وجہ سے نہ بدل سکیں)' عام آبادی کو حزب اللہ کا مخالف بنانا (بے تحاشا بم باری نے عیسائی مسلمان' شیعہ سنّی سب کو ایک کر دیا)' لبنانی اور شام کی حکومتوں پر دباؤ ڈالنا (امریکی وزیر خارجہ کو "دہشت گرد" حافظ اسد کی خوشامد کرنا پڑی)' حماس کے حملوں میں ۵۹ اسرائیلیوں کے ہلاک ہونے پر بہنے والے اسرائیلی آنسو پونچھنا' اور سب سے بڑھ کر ۲۹ مئی کے انتخابات میں شمعون پیریز کی کامیابی کے امکان کو روشن بنانا۔ اگر دہشت گردی کی تعریف یہ ہے کہ سیاسی مقاصد کے لیے شہریوں کو نشانہ بنایا جائے' تو اسرائیل کا یہ حملہ ایک سو ایک فی صد دہشت گردی تھا۔ لیکن کیونکہ یہ کام شہنشاہ کے کارندے نے کیا' اس لیے کس کی مجال ہو سکتی ہے جو یہ کہے کہ "حضور' اصل اور بڑے ڈاکو تو آپ ہیں!"

لبنان کے خلاف اسرائیل کی دہشت گردی کی یہ واردات نہ نئی ہے نہ تعجب خیز۔ اسرائیل کے نزدیک جنوبی لبنان اور دریائے لیطانی کے پانی کا مالک وہ ہے۔ پھر جب ستمبر ۱۹۷۰ میں 'شاہ حسین نے' اسرائیل اور امریکہ کی خوشنودی کی خاطر' ہزاروں فلسطینیوں کو قتل کر کے پی ایل او کو دربدر کیا' تو انھوں نے بھی لبنان میں ٹھکانہ بنایا اور وہاں سے اسرائیل کے خلاف کہیں کہیں چھوٹی موٹی کارروائیاں کر دیں۔ چنانچہ اب تک اسرائیل لبنان پر تین بہت بڑے اور بے شمار ان سے کم بڑے حملے کر چکا ہے۔ مارچ ۱۹۷۸ میں پہلے خونیں حملے میں ۲ ہزار ہلاک' ڈھائی لاکھ بے گھر' اور بے شمار علاقے تاخت و تاراج ہوئے۔ ۶ جون ۱۹۸۲ کو اسرائیل نے دوسرا حملہ شروع کیا۔ ستمبر میں بیروت پر قبضہ کر لیا' صبرہ و شاتیلا کیمپ عیسائی فوج کے حوالے کر دیا' جس نے وہاں ایسا قتل عام کیا کہ دنیا کو پہلی دفعہ کچھ پتہ چلا کہ "شہنشاہ" کیا کچھ نہیں کر رہے۔ یہ بھی پی ایل او کی "دہشت گردی" کے خلاف رد عمل تھا

جس میں ۴ سال میں ۲۹ اسرائیلی ہلاک ہوئے تھے! لیکن اس "ردعمل" کا نتیجہ: ۲۰ ہزار ہلاک (۴۰ ہزار صرف بیروت میں)، کیمپ اور بستیاں مسمار، لاکھوں بے گھر۔ تیسرا حملہ، اس نے جولائی ۱۹۹۳ میں کیا۔ ۱۹۸۲ کے بعد سے اس نے اپنی فوجیں داخل کرنے کی حماقت تو نہ کی مگر حالیہ آپریشن کی طرح جہازوں اور توپوں سے بے پناہ بم باری کر کے لاکھوں کو بے گھر کیا، اور سیکڑوں کو ہلاک۔ ان کے علاوہ، ۱۹۷۰ سے مسلسل حملے کر کے وہ لبنان میں جو ہلاکت مچاتا رہا ہے، اس کا تو ذکر یہاں ممکن نہیں۔ ۱۹۷۶ میں لبنانی فوج کا اندازہ یہ تھا کہ ہر دو دن میں تین دفعہ اسرائیلی حملے ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۵ میں روزانہ ۱۷ حملے ہوئے، اکتوبر ۱۹۷۷ تک جنوب سے مستقل پناہ گزینوں کی تعداد ۳۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔

لبنان کے خلاف کارروائیاں بھی ایک بڑی کہانی کا حصہ ہیں۔ اسرائیل کی پیدائش ہی دہشت گردی کے نتیجے میں ہوئی ہے، وہ قائم بھی دہشت گردی کے بل پر ہے۔ لیکن آگسٹائن کی کہانی یہ بخوبی واضح کر دیتی ہے کہ فن کاری کا کمال یہ ہے کہ یہ دہشت گردیاں کرنے والے، سب کچھ کرنے کے بعد بھی، خود "شہنشاہ" بنے رہتے ہیں۔ اور باقی سب کو "ڈاکو" قرار دے کر ان کی سرکوبی کرتے رہتے ہیں۔ کون سی کارروائی دہشت گردی ہے، اس کا انحصار اس پر نہیں کہ "کیا کارروائی ہوئی"، "کیوں" ہوئی بلکہ اس پر ہے کہ "کس" نے کی۔ بین الاقوامی دہشت گردی کے خلاف امریکہ کے سارے جوش و خروش اور مہم آرائی کا مقصد دہشت گردی کا انسداد نہیں، بلکہ اپنے اہداف کی تکمیل، اپنے مفادات کا حصول اور تحفظ، اپنے مخالفین کی سرکوبی اور اپنے اور اسرائیل کے جرائم پر پردہ ڈالنا ہے۔

اسرائیل کی دہشت گردیاں رپورٹ نہیں ہوتیں، رپورٹ ہو جائیں تو ہر کارروائی دہشت گردی کے خلاف "جائز ردعمل" اور اپنے "حق دفاع کا استعمال" شمار ہوتی ہے۔ دوسروں کا ہر فعل، خواہ اپنی آزادی اور حقوق کے لیے ہو، یا ردعمل کے طور سے، دہشت گردی شمار ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کے اغوا کی پہلی واردات، اسرائیل نے کی، جب ۱۹۵۴ میں اس کے فائٹرز نے ایک شامی ہوائی جہاز کو لدہ کے ایرپورٹ پر اتار لیا۔ اس وقت کے وزیراعظم موشے شیرٹ کی ڈائری کے مطابق: "چیف آف اسٹاف موشے دایان کا مقصد مسافروں کو یرغمال بنانا تھا تاکہ شام سے اسرائیلی جنگی قیدی رہا کرائے جا سکیں"۔ پہلا سیاسی قتل ۱۹۴۸ میں اسرائیل نے کیا، جب یو این کے صلح کنندہ، کاونٹ برناڈوٹ کو اسرائیلیوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس ہلاکت کے ذمہ دار تین کمانڈروں میں سے ایک، اسحاق شامیر تھے، جو بعد میں وزیر خارجہ رہے، دوسرے وزیراعظم بن گوریان کے گہرے دوست تھے۔ امریکہ اور اسرائیل وہ پہلے ملک ہیں جنھوں نے بالترتیب ایران (۱۹۸۱) اور لیبیا (۱۹۷۳) کے مسافروں سے بھرے طیارے مار گرائے۔ اسی طرح اسرائیل کی بحریہ، مسافروں سے بھری کشتیاں اور

چھوٹے جہاز اغوا کر کے عیسائیوں کے حوالے کرتی رہی ہے، جو انھیں موت کے گھاٹ اتارتے رہے ہیں۔

شہریوں کو قتل کرنا، ان کی بستیوں کو مسمار کرنا، ان کو گھروں سے نکال کر بے گھر کرنا یہ تو اسرائیل کے لیے آغاز ہی سے معمول کی کارروائیاں رہی ہیں۔ افسانہ تو یہ گھڑا گیا کہ فلسطینی خود گھر اور زمینیں چھوڑ چھوڑ کر چلے گئے، لیکن اب تو خود اسرائیلی مورخین مثلاً بنی مارس (Morris)، الوی سلائم (Shalaim) اور آئی لین پٹی (Patty) سرکاری دستاویزات کی بنیاد پر یہ حقیقت تسلیم کر رہے ہیں کہ ایک منظم اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آبادیوں کی آبادیاں موت کے گھاٹ اتاری گئیں، لوگوں کو بھاگنے پر مجبور کیا گیا، ان سے جبراً کاغذات دست برداری پر دستخط کرائے گئے۔ اسرائیلی وزیراعظم بیگن کی دہشت گرد تنظیم نے اپریل ۴۸ ہی میں دیر یاسین نامی بستی کے ۲۵۰ نہتے باشندوں کو جن میں ۱۰۰ سے زائد عورتیں اور بچے شامل تھے، موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اپنے مبارک بادی تار میں کہا: "جس طرح دیر یاسین میں، اس طرح ہر جگہ.... اے رب، اے رب! آپ نے ہمیں فتح کے لیے چن لیا ہے"۔ اسی طرح ایریل شیرون کی سرکردگی میں، یونٹ ۱۰۱ نے اگست ۵۳ میں غزہ میں البریج کیمپ پر حملہ کر کے ۵۰ پناہ گزین قتل کر دیے، پھر اکتوبر ۵۳ میں اردن میں قبیہ نامی گاؤں پر حملہ کر کے اسے پورا تہس نہس کر دیا۔

لبنان میں اسرائیل کی وحشیانہ کارروائیوں کی امریکہ کی طرف سے مکمل حمایت اور پشت پناہی بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ امریکہ شروع ہی سے اسرائیل کے سارے جرائم میں اس کی بھرپور مدد کرتا رہا ہے۔ یہ امریکہ ہی ہے جو اسرائیل کو سب سے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ مالی امداد دیتا رہا ہے، وہ بہترین اسلحہ فراہم کرتا رہا ہے جن کے ذریعے اس نے کشت و خون کر کے اپنے سیاسی مقصد حاصل کیے ہیں۔ اس نے اسرائیل کے انسانیت کش جرائم کی مذمت تک نہیں ہونے دی ہے، الٹا ان پر پردہ ڈالا ہے اور ان کو جائز اور مبنی برحق بنا کر پیش کیا ہے، اور اس کی پیٹھ ٹھونکی ہے۔ گویا امریکہ نے اسرائیل کو کھلا لائسنس فراہم کیے رکھا ہے کہ جہاں چاہے گھس جائے، جس کو چاہے مارے، جس بستی کو چاہے تباہ کر دے، جن کو چاہے گھروں سے نکال دے، جس زمین پر چاہے قبضہ کر لے۔ اس تعاون و پشت پناہی میں حکمران، سیاست دان، دانش ور اور میڈیا، سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر، ۱۹۷۸ تا ۱۹۸۲ کے دوران امریکہ نے اپنی کل عالمی فوجی امداد کا ۴۸ فی صد اور اقتصادی امداد کا ۳۵ فی صد حصہ تنہا اسرائیل کو دیا۔ جب اسرائیل نے دہشت گردی کی کوئی بڑی

کارروائی انجام دی ' امریکہ نے اس کی پیٹھ بھی ٹھونکی اور اس کو خصوصی امداد کا تحفہ بھی دیا۔ ۱۹۸۲ میں بیروت پر حملہ اور قتل عام کے فوراً بعد صدر ریگن نے اسرائیل کے لیے اڑھائی ارب ڈالر کی امداد کی تجویز کانگریس کو بھیجی۔ کانگریس کو مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اسرائیل کو "سزا" دینے کے لیے امداد میں یہ اضافہ کافی ہے ' یا مزید اضافے کی ضرورت ہے۔

اکتوبر ۱۹۸۵ میں اسرائیل نے تیونس پہنچ کر پی ایل او کے ہیڈکوارٹر پر امریکہ کے دیے ہوئے وہ تیز و ذہین (smart) بم برسائے جنھوں نے ۷۵ شہریوں کو خاک بنا کر رکھ دیا۔ اسی امریکہ نے اس بم باری کا سرکاری طور پر خیرمقدم کیا اور اسے دہشت گردی کے خلاف ایک جائز جواب قرار دیا۔ اس کے صلے میں صدر ریگن نے ۱۷ اکتوبر کو وزیراعظم شمعون پیری کا واشنگٹن میں والہانہ استقبال کیا اور کہا آج امریکہ اور اسرائیل کے درمیان "غیر معمولی" ہم آہنگی ہے۔ ظاہر ہے کہ امریکہ اسرائیلی جہازوں کے تیونس جانے سے بے خبر کس طرح ہو سکتا تھا۔ ساتھ ہی دونوں نے "دہشت گردی" کی لعنت کا مقابلہ کرنے اور اسے "امن" کی راہ میں حائل نہ ہونے دینے کے عزم کا اعلان کیا۔ اور اب اپریل ۱۹۹۶ میں لبنان میں یہ ساری دہشت گردی مچانے کے بعد ' شمعون پیری پھر واشنگٹن گئے ہیں تاکہ "دہشت گردی" کے مقابلے کے لیے خصوصی آلات و اسلحہ اور امداد حاصل کر سکیں۔

بیروت میں قتل عام کے بعد ' ۲۶ جون ' ۱۹۸۳ کو جب سیکورٹی کونسل نے متفقہ طور پر اسرائیل اور پی ایل او دونوں سے مطالبہ کیا کہ وہ وہاں سے اپنے فوجی دستے ہٹا لیں ' تو یہ امریکہ تھا جس نے اس قرارداد کو ویٹو کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی اسرائیل کے کسی بھی اقدام کی مذمت میں کوئی بھی قرارداد پیش ہوئی تو امریکہ نے اس کی مخالفت کی ' پاس ہوئی تو اسے ویٹو کر دیا ' یہاں تک کہ مسجد الخلیل میں ایک اسرائیلی انتہاپسند کی طرف سے نمازیوں کے قتل عام کی مذمت کو بھی اس نے ویٹو کر دیا۔ اور اب تو سیکورٹی کونسل کو اجلاس کرنے اور بحث کرنے کی بھی جرات نہ ہوئی ' مذمت تو بہت دور کی بات ہے۔

اس میں کسی شک کی گنجایش نہیں کہ امریکہ ' اسرائیل کے تمام جرائم میں برابر کا شریک ہے۔ لیکن یہ بات ضرور بحث طلب ہے کہ امریکہ یہودی لابی کے زیر اثر ' اسرائیل کا تابع مہمل بنا یہ سب کچھ کر رہا ہے ' یا فی الواقع ڈوری کا سرا اسی کے ہاتھ میں ہے ' اور اسرائیل روز اول سے مشرق وسطی میں امریکہ کے عالمی اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے اس کے آلہ کار کے طور پر یہ سارے کام انجام دے رہا ہے۔ "یہودی اثرات و طاقت" اور "یہودی سازشوں" کے وجود کے بارے میں بھی دلائل کمزور نہیں ' لیکن ہمیں دوسری بات زیادہ قرین قیاس لگتی ہے کہ اصل مجرم امریکہ ہے ' اور اسرائیل اس کا کارندہ۔ اگر امریکہ رسی دراز نہ کرتا ' تو اسرائیل قائم ہی نہ ہو سکتا تھا ' یہ سب کارروائیاں تو

دور کی بات ہے ۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ یہود کو ذلت و مسکنت سے اگر کچھ نجات ملے گی تو وہ حَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کے نتیجے میں ۔

دراصل امریکہ نے تو دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی عالمی غلبہ و تسلط کا منصوبہ بنا لیا تھا ۔ ۱۹۴۶ سے لے کر آج تک ، گذشتہ نصف صدی میں وہ بڑی خوب صورتی سے اس منصوبے کو عملی جامہ پہناتا رہا ہے ۔ یہاں تک کہ آج وہ اس پوزیشن میں ہے کہ کہہ سکے کہ "۲۱ویں صدی ، امریکہ کی صدی ہے" ۔ کیوں کہ آج "ہم چوما دیگرے نیست" اور "من اشدمنا قوۃ" (فارن افیرز ، مارچ اپریل ۹۶ ، ص ۲۰ تا ۵۴) ۔ یہ ایک الگ بڑا اہم مگر تفصیل طلب موضوع ہے ، جسے ہم کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں ۔ بہرحال مشرق وسطیٰ کی حد تک امریکہ نے اپنے اسٹریٹیجک اہداف ڈھکے چھپے نہیں رکھے ہیں ۔ اسرائیل فی نفسہ امریکہ کے لیے کوئی اسٹریٹیجک اثاثہ (asset) نہیں ، اصل اہمیت تیل کی ہے ، مارکیٹ کی ہے ۔ ۱۹۴۵ میں اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اس نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ "سعودی عرب اسٹریٹیجک پاور کا ایک عظیم مخزن ہے ۔ یہ عالمی تاریخ میں سب سے بڑا مادی انعام ہے" ۔ چنانچہ اس انعام کو جیتنے اور اپنے قبضے میں رکھنے کا امریکہ نے تہیہ کر لیا ۔ اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اربوں پٹرو ڈالر بھی امریکہ کے معیشت کے اندر رہنا چاہییں ۔

اس مقصد کے لیے اس نے برطانیہ ، فرانس اور یورپ کو مشرق وسطیٰ سے نکال باہر کیا ، یونان اور ترکی پر تسلط قائم کیا اور ہر عرب ملک میں ایسے جابر و مستبد حکمران مسلط کیے جن کا اقتدار اس کی حمایت کا محتاج ہو ۔ اسی منصوبے کی تکمیل کے لیے امریکہ نے اسرائیل کو اپنی پٹھو ریاست (client state) کے طور پر قائم کیا ، مضبوط کیا ، طاقت ور بنایا ، یہاں تک کہ آج وہ فوجی لحاظ سے مشرق وسطیٰ کی سب سے طاقت ور ریاست ہے ۔ اس کے پاس کم سے کم ۲۰۰ ایٹم بم ہیں ، جن کا تذکرہ امریکہ میں ممنوع ہے ۔ اس لیے اس نے ہر برے بھلے وقت میں اسرائیل کا پورا ساتھ دیا ، اس کی ہر حرکت کی پوری پشت پناہی کی ، کیونکہ اس حرکت کا نفع امریکہ کے کھاتے میں جاتا تھا ۔ مصر سب سے بڑا عرب ملک تھا ۔ سادات نے یروشلم کا "حج" بھی کیا ، آنکھیں بند کر کے کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر دستخط بھی کیے ۔ امریکی وزیر دفاع ولیم پیری کے الفاظ میں "مصر سے ہم وہ سب کچھ کرا سکتے ہیں جو چاہتے ہیں" ۔ پی ایل او چند میونسپلیٹیاں لے کر فلسطینیوں کو دبانے میں اسرائیل کی شریک کار ہو گئی ۔ اس وقت اس کی جیلوں میں ۱۳ ہزار قیدی ہیں ۔ عراق تباہ و برباد ہے ۔ ایران کمزور ہے ، اس کے گلے میں پھندا کسا جا رہا ہے ۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں کویت ، امارات ، عمان ، قطر ، امریکن اڈوں میں تبدیل ہو چکی ہیں ۔ لبنان میں اسرائیل نے اتنی ہولناک کارروائی کی ، مگر کسی عرب ملک نے چوں تک نہ کی ۔ حالانکہ دنیا کے ان ۱۰ ملکوں میں سے جو سب سے زیادہ فوجی اسلحہ اور ساز و سامان خریدتے ہیں سات عرب

ممالک ہیں۔ مطلوبہ پرائز امریکہ کے قبضے میں ہے۔ ۵۰ سال میں امریکہ نے جو کچھ حاصل کر لیا ہے' کیا اسرائیل کی حمایت و پشتیبانی کا یہ نفع کچھ کم ہے۔ اسرائیل نے کیا حاصل کیا ہے؟ ایک ریاست جو مستقل دشمنوں سے گھری ہوئی ہے' خطرے میں ہے' امریکہ کے رحم و کرم پر ہے۔ اس کے "عظیم تر اسرائیل" اور "مشرق وسطیٰ پر تسلط کے منصوبے اب تک خواب و خیال ہیں۔ ہاں' اس نے امریکہ کے خوابوں کو حقیقت بنانے میں اپنا کلیدی کردار ادا کر دیا ہے۔

یہ بربریت اور درندگی' یہ دھوکے اور فریب کا کاروبار' یہ غیرانسانی اور انسانیت سوز حرکات کیوں کر ممکن ہو رہی ہیں؟ اسباب کیا ہیں؟ جڑیں کہاں ہیں؟

جہاں تک لبنان کے خلاف طویل دہشت گردی کا تعلق ہے' تو اس کا اصل سبب اسرائیلی اہداف ہیں۔ ان اہداف کی تکمیل میں مکمل ساتھ دینا یقیناً امریکی مفاد میں بھی ہے' اگرچہ بعید نہیں کہ امریکہ کے پیش نظر ان ۲۴۱ فوجیوں کا انتقام بھی ہو' جن کو حزب اللہ نے اکتوبر ۸۳ میں بم سے اڑا دیا تھا۔ اسرائیل کا طویل المعیاد ہدف اس دستاویز سے واضح ہے جو ۱۹۱۹ میں ورلڈ زایانسٹ آرگنائزیشن نے' ورسیلز کانفرنس کو دیا تھا۔ اس دستاویز میں مطلوبہ عظیم تر اسرائیل میں دریائے لیطانی تک پورا جنوبی لبنان شامل ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ سے ہر اسرائیلی لیڈر جنوبی لبنان پر قبضہ کرنا اپنا حق سمجھتا آیا ہے۔ ۱۹۴۸ میں جب اسرائیل قائم ہوا تو پہلے وزیراعظم بن گوریاں نے کہا: "لبنان میں ایک عیسائی حکومت قائم ہونا چاہیے' جس کی جنوبی سرحد دریائے لیطانی ہو"۔

موشے شیرٹ اپنی ۱۹۵۵ کی ڈائری میں لکھتا ہے: موشے دایان کا کہنا ہے کہ ہم کو صرف ایک میجر چاہیے' جس کو ہم جیت لیں یا خرید لیں' اور جو خود کو عیسائیوں کا نجات دہندہ قرار دے۔ بس پھر اسرائیلی فوج لبنان میں داخل ہو جائے گی' ایک عیسائی حکومت قائم کر دے گی' اور دریائے لیطانی کے جنوب کا سارا علاقہ اسرائیل میں شامل کر لیا جائے گا۔ یہ کام ہمیں فوراً ..... بلکہ کل ..... ہی کر لینا چاہیے"۔ اسرائیل کی بدقسمتی سے فلسطینیوں اور ان کے بعد حزب اللہ کی جرات نے ان کا یہ منصوبہ درہم برہم کر دیا۔ ۲۳ سال بعد' ۱۹۷۸ کے حملہ میں وہ جنوبی لبنان میں ایک میجر سعد مراد تلاش کر پایا' اور ایک عیسائی حکومت قائم کر دی۔ پھر ۱۹۸۲ میں اس نے بیروت پر قبضہ کر کے' فلسطینیوں کا قلع قمع کیا۔ لیکن اب حزب اللہ میدان عمل میں آگئی۔ بقول کسے "فلسطینی تو مارنے کا مقصد لے کر آئے تھے' حزب اللہ کے مجاہد مرنے کی تمنا لے کر آتے ہیں"۔ ان کا مقابلہ کس طرح ممکن تھا۔ چنانچہ آج ۱۴ سال ہو گئے ہیں' مگر اسرائیلی فوجی کسی طرح جنوبی لبنان پر قبضہ نہیں رکھ پا رہے۔ حزب اللہ ۹۰ سے اوپر فوجیوں کو ہلاک کر چکی ہے' وہ ان کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ یہ نقصان اسرائیل کے لیے زبردست نقصان ہے۔ اسرائیل کی ساری دہشت گردی ۱۹۱۹ کے عظیم تر اسرائیل کی جستجو میں اور

حزب اللہ کے خلاف غم و غصہ کی وجہ سے ہے۔

یہ اسباب تو اسٹرے ٹیجک ہیں۔ بربریت کی اصل جڑیں ہمیں بہ آسانی مغرب کی تہذیب، کلچر اور تاریخ میں مل جائیں گی۔ ان جڑوں کی نقاب کشائی بھی آگسٹائن کی کہانی بہ خوبی کرتی ہے۔ اپنی تہذیبی و نسلی فوقیت کے نشے میں خود کو شہنشاہ سمجھنا اور اپنے لیے ہر کارروائی جائز سمجھنا، اور جو راہ میں حائل ہوں، ان کو "دو ٹانگوں کے وحشی جانور" قرار دے کر ان کا صفایا کرنا۔ ابھی بوسنیا میں جو نسلی صفائی ہوئی، ۶ لاکھ کی بات تو افسانہ ہی ہے لیکن مہذب یورپ میں خود یہودیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، امریکہ نے ریڈ انڈینوں کا جس طرح صفایا کیا۔ ہٹلر امریکہ پر رشک کرتا ہوا مرگیا کہ اس نے اپنی نسلی اقلیت، ریڈ انڈین کا مسئلہ کتنی خوش اسلوبی اور خاموشی سے حل کر لیا کہ وہ ۲۰ لاکھ سے صرف ۲ لاکھ رہ گئے۔ یہ چند نمونے اسی "تہذیب اور کلچر" کے ہیں۔

جارج واشنگٹن لکھتا ہے: انڈینوں میں 'کوئی چیز انسانی نہیں' سوائے شکل کے۔ جیسے ہماری آبادکاری بڑھے گی، ہم ان وحشیوں کو، بھیڑیوں کی طرح، نکال باہر کرتے رہیں گے۔ دونوں ہی شکاری درندے ہیں، خواہ شکل میں مختلف ہوں۔ اسرائیل بھی اسی ذہن اور تہذیب کی پیداوار ہے۔

ہم نے یہ کہانی اس لیے کھول کر بیان نہیں کی کہ ہم امریکہ اور اسرائیل کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں، یا امریکہ اور اسرائیل کی دہشت گردیوں کی نقاب کشائی اور ان کے کلچر و تہذیب میں اس کی جڑوں کی نشان دہی کر دینے کو کافی اور مسئلے کا حل تصور کرتے ہیں۔ ہاں، ہم امریکہ اسرائیل اور دیگر مغربی طاقتوں اور مغرب کے ناواقف عوام کے سامنے، ان کے مہذب ہونے، حقوق انسانی کا علمبردار ہونے اور دہشت گردی کا دشمن ہونے کے دعاوی اور عزائم کے حوالے سے، پوری حجت قائم کرنا ضروری اور مفید سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ خود مسلمانوں کو بین الاقوامی سیاست کاری کا صحیح ادراک اور شعور حاصل ہو۔ انھیں معلوم ہو کہ "شہنشاہ" کس طرح بے گناہوں کو "دہشت گرد" قرار دیتے ہیں، چھوٹے چھوٹے "دہشت گردوں" کے خلاف زبردست شور و غل مچاتے ہیں، اور پوری پوری قوموں کو "دہشت گردی" کے الزام میں صلیب پر چڑھاتے ہیں، لیکن اس طرح وہ عام لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں اور عالمی پیمانے پر اپنی بڑی بڑی فوجی طاقتوں سے دہشت گردی مچانے کے جرائم پر تہذیب کا پردہ ڈالتے ہیں۔

مسئلہ کی اصل جڑ تو ہمیں اپنے اندر ہی تلاش کرنا ہوگی، اس کا حل بھی اپنے اندر ہی سے نکالنا ہوگا۔ ورنہ ہم ہر "لبنان"، ہر "بوسنیا"، ہر "چیچنیا"، ہر "کشمیر" اور ہر "فلسطین" پر خون کے آنسو تو ضرور بہا سکتے ہیں، ان کے دوبارہ وقوع پذیر ہونے کو نہیں روک سکتے۔ دشمن سے گلے کا کیا فائدہ اور کیا جواز، کہ تم نے ہمارے ساتھ دشمنی کیوں کی، اور اتنی وحشیانہ دشمنی کیوں کی۔ اگر ذلت و

مسکنت ' لاچاری و ناطاقتی ہمارا مقدر بن چکی ہے تو اس کی اصل وجہ ہمارے اندر ہے ' اگر دشمن ہمارے اوپر مسلط ہے تو اس کا باعث ہم خود ہیں۔ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے میں شک کی کیا گنجایش ہے ھی اعمالکم ترد علیکم (یہ تمھارے ہی اعمال ہیں جو تمھیں واپس کیے جا رہے ہیں) فمن وجد خیر افلیحمد اللہ ومن وجد غیر ذالک فلا یلومن الا نفسہ "بس جو بھلائی اور خیر پائے وہ اللہ کا شکر کرے ' اور جو اس کے خلاف کچھ پائے ' وہ اپنے علاوہ کسی کو ملامت نہ کرے"۔

حکمرانوں کی بے حسی اور امریکہ کی غلطی پر بھی ہم جتنے آنسو بہائیں کم ہے۔ لیکن اس کا بھی کوئی حاصل نہیں۔ یہ حکمران اسی وقت تک ہمارے اوپر مسلط ہیں ' اور رہ سکتے ہیں ' اور اسی وقت تک قوم کو فروخت کر سکتے ہیں ' اور ارزاں فروخت کر سکتے ہیں ' جب تک قوم بحیثیت مجموعی ان کو برداشت کر رہی ہے ' اور ان کے پھندے سے آزاد ہونے کے لیے کچھ کرنے کو تیار نہیں۔

مایوسی کی بھی کوئی بات نہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں ہونے والے واقعات یقیناً غم ناک ہیں ' مایوسی کا کینسر بھی پیدا کرتے ہیں ' لیکن ہم کو اپنا زاویہ نظر وسیع کرنا ہوگا۔ نصف صدی کی مدت ' حیات اجتماعی میں کوئی طویل مدت نہیں ہوتی۔ اگر ہم ۱۹۴۶ اور ۱۹۹۶ کا موازنہ کریں ؟ تو ہم دیکھیں گے کہ امت کے جسد بے جان میں زندگی کی لہر نے دوڑنا شروع کر دیا ہے۔ سیکڑوں سال کی بیماری پلک جھپکتے میں دور نہیں ہو سکتی ' نہ قعر ذلت سے اٹھ کر کوئی قوم اچانک بام عزت پر پہنچ سکتی ہے ' لیکن امت کے مقصد اصلی کے شعور ' اس کے ساتھ وابستگی ' اس کے لیے سعی و جہد اس کے مخالفین کی مزاحمت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے ' بلکہ یہ سارے اثاثے کم و بیش اسی نصف صدی کی پیداوار ہے۔

ضرورت اس کی ہے کہ جو جاگ رہے ہیں ' وہ دوسروں کو جگائیں ' جو کھڑے ہیں وہ دوسروں کو کھڑا کریں ' جو چل رہے ہیں وہ دوسروں کو چلائیں۔ گہری للہیت اور پرجوش انقلابیت کے ساتھ متحد ہو کر ہم آگے بڑھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد نہ کرے ' اور من بعد غلبھم سیغلبون (الروم) کی صبح نہ طلوع ہو۔

ہماری قوت کا خزانہ اللہ پر ایمان اور اللہ کے ساتھ وابستگی میں ہے۔ ہمارے غلبے کا راز اللہ کے دین کے لیے ' رسالت کے مشن کی تکمیل کے لیے ' جان و مال کی بازی لگا دینے میں ہے۔ ہماری طاقت کا راز اس امت کو متحد رکھنے اور اس کا دائرہ وسیع کرنے میں ہے۔ جو کان دھرنے کو تیار ہو ' جس کے پاس دل دردمند ہو ' وہ آگے بڑھے ' اور لبیک کہے۔ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔ کشمیر میں مٹھی بھر لوگ ۶ لاکھ فوج کا ناطقہ بند کیے ہوئے ہیں۔ چیچنیا میں مٹھی بھر مجاہدین نے ایک سپرپاور کو لاچار کر دیا ہے ' لبنان میں مٹھی بھر حزب اللہ نے شہنشاہ اور اس کے کارندے کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ ۲:۲۴۹)۔

حضرت معاذ بن جبل روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس باتوں کی وصیت کی۔

آپ ؐ نے فرمایا:

☆ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' چاہے تجھے قتل کیا جائے' یا جلایا جائے۔

☆ ماں باپ کی نافرمانی نہ کرنا' خواہ وہ تجھے عاق کر دیں اور گھر سے نکال دیں۔

☆ فرض نماز کو ترک نہ کرنا کیونکہ جس نے فرض نماز قصداً چھوڑی' تو اللہ اس سے بری الذمہ ہے۔

☆ شراب نہ پینا کیونکہ یہ تمام فحش کاموں کی بنیاد ہے۔

☆ گناہ سے بچتے رہنا کیونکہ اس سے اللہ کی ناراضگی نازل ہوتی ہے۔

☆ میدان جہاد سے فرار نہ ہونا' چاہے لوگ قتل ہو رہے ہوں۔

☆ جب لوگ مرنے لگیں اور تم وہاں موجود ہو تو وہاں ٹھہرے رہو

☆ اپنی اولاد پر استطاعت کے مطابق خرچ کرو'

☆ ان کو ادب سکھانے کے لیے عصا رکھو'

اور ---ان کو اللہ سے ڈراؤ۔ (مشکوۃ شریف بحوالہ مسند احمد)

خالق کا شاہکار

سید قطب شہید

ترجمہ: سید حامد علی

انسان کے حواس' احساسات اور عقل و ضمیر کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کے بعد قرآن انسان کی موجودہ حالت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ انسان غافل و بے پرواہ ہے! وہ انسانی قلب کو ایک خوش گوار عتاب سے' جس کے اندر وعید پوشیدہ ہے' جھنجھوڑتا ہے' وہ اسے خدا کا اولین احسان یاد دلاتا ہے کہ اسے خدا نے ایک کامل' معتدل اور متوازن صورت میں پیدا کیا۔ اس کا رب اس کو' کسی اور صورت میں' جسے وہ چاہتا' پیدا کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ خدائے تعالیٰ نے اسی معتدل' متوازن اور خوب صورت شکل کو اس کے لیے پسند فرمایا مگر انسان نہ اس کا شکر ادا کرتا ہے' نہ اس کی قدر و منزلت پہچانتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ - الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ - فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ - (الانفطار ۸۲: ۶'۷'۸)

"اے انسان! کس شے نے تجھے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے! جس نے تجھے پیدا کیا' تجھے ٹھیک ٹھاک کیا' تجھے معتدل و متناسب بنایا' اور جس صورت میں چاہا' جوڑ کر تجھے تیار کیا!"

خدا تعالیٰ نے يَاأَيُّهَا الْإِنسَانُ "اے انسان" کہہ کر خطاب فرمایا ہے۔ اس طرح خدا نے انسان کو اس کی اس صفت سے یاد کیا ہے' جو اس کے وجود میں سب سے زیادہ معزز و بزرگ ہے یعنی "انسانیت"' جس کے باعث وہ سب موجودات میں ممتاز ہے' جس کی بنا پر وہ بلند ترین مقام پر فائز ہے' جس کی صورت میں خدائے تعالیٰ کے عظیم احسان کا اس پر فیضان ہے! اور اللہ کی' اس کے لیے تکریم جلوہ فگن ہے!

اس خطاب کے بعد ایک حسین و جلیل عتاب ہے! مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ "کس شے نے تجھے اپنے

رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے!؟" اے انسان! تو اپنے رب کے سلسلے میں کیوں فریب خوردہ ہے؟ تیرا رب تو تیرا محافظ، نگراں اور پالن ہار ہے، اس نے تجھے اپنے کرم سے نوازا اور معزز و بزرگ انسانیت سے سرفراز کیا ہے، تو اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، اس کے احکام کی تعمیل میں سستی برتتا ہے، اور اس کی جناب میں بے ادبی کا مرتکب ہوتا ہے، حالانکہ وہ تیرا کریم رب ہے۔ اس نے تجھے اپنی نعمتوں سے خوب خوب نوازا ہے۔ انھی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت تیری "انسانیت" ہے جس کی بنا پر تو تمام مخلوقات سے ممتاز ہے اور جس کے نتیجہ مین تجھے تمیز اور عقل کی نعمتیں ملی ہیں جنھیں پاکر تو خدا کے بارے میں مناسب و نامناسب، ہر طرح کی باتیں سوچتا ہے۔

پھر قرآن اس خدائی فضل کی، جسے یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ میں مجملاً بیان فرمایا ہے --- اور اس مجمل تعبیر میں اشارات و معانی کا ایک خزانہ پنہاں ہے --- اور جو "انسانیت" کی صورت میں اسے عطا ہوا ہے، اس فضل کی کچھ تفصیل تخلیق، تسویہ اور تعدیل سے بیان فرماتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس صورت میں چاہتا، اسے پیدا کر سکتا تھا۔ دوسری صورتوں کے بجائے، انسان کے لیے اس موزوں اور بہترین صورت کو اختیار کرنا اس کے بے پایاں فضل و کرم کا نتیجہ ہے مگر انسان نہ اس کا شکر ادا کرتا اور نہ اس کی قدر و منزلت کرتا ہے، اس کے بجائے وہ فریب خوردگی و لاپرواہی کا شکار ہے:

یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ - الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ - فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ -

یہ ایک ایسا خطاب ہے جو انسانی وجود کے ایک ایک ذرے کو --- اگر اس کی انسانیت زندہ ہے --- ہلا کر رکھ دیتا اور دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اس کا کریم رب اس "بزرگ عتاب" سے اسے مخاطب کر رہا ہے، اپنے احسانات اسے یاد دلا رہا ہے، حالانکہ وہ غافل و تقصیروار ہے اور اپنے مالک و آقا کے سلسلے میں، جس نے اسے پیدا کیا، ٹھیک ٹھاک کیا اور معتدل و متوازن بنایا، بے ادبی کا مرتکب ہے۔

انسان کی، اس حسین، معتدل و متناسب اور کامل صورت میں، جو شکل اور خصوصیات، دونوں کے لحاظ سے کامل ہے، تخلیق ایک ایسا امر ہے جو طویل غور و فکر، عمیق شکر اور فراواں ادب کا سزاوار ہے۔ اس پر غور و فکر کے نتیجے میں انسانی قلب میں "رب کریم" کے لیے محبت امنڈتی ہے جس نے محض اپنی عنایت و نوازش سے انسان کو یہ کامل، متوازن اور حسین و جمیل صورت عطا فرمائی۔ وہ اسے کسی اور صورت میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کی ترکیب حسین، جس کی خلقت متوازن اور جس کے جوڑ بند معتدل ہیں۔ اس کے وجود کے عجائبات بے شمار اور انسانی علم و فہم کے احاطہ سے باہر ہیں۔ گردوپیش

میں جو مخلوقات نظر آتی ہیں ' انسان ان سب سے زیادہ عجیب اور حیرت انگیز ہے !

یہ حسن ' یہ توازن اور یہ کمال جس طرح انسانی جسم کی ساخت میں ہے ' ٹھیک اسی طرح اس کی عقل اور روح میں ہے ۔ انسان کا پورا وجود حسن ' توازن اور کمال کا اعلیٰ نمونہ ہے !

انسانی اعضا کی ساخت کے کمال دقت و باریکی اور مضبوطی و استحکام کی وضاحت کے لیے پوری پوری کتابیں تصنیف ہوئی ہیں ۔ یہاں انسانی ساخت کے عجائبات کو تفصیل سے بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے ۔ ہم بعض عجائبات کی طرف صرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے ۔ انسان کی جسمانی ساخت کے خاص خاص پہلو یہ ہیں:

ہڈیوں کا نظام ' عضلات کا نظام ' جلد کا نظام ' ہضم کا نظام ' خون کا نظام ' سانس کا نظام ' توالد و تناسل کا نظام ' شرائین کا نظام ' پٹھوں کا نظام ' پیشاب کا نظام ' چکھنے ' سونگھنے ' سننے اور دیکھنے کا نظام !

ان میں سے ہر نظام اتنا حیرت انگیز ہے کہ انسان کی بنائی ہوئی تمام عجیب و غریب مشینیں ' جنھیں دیکھ کر انسان حیران و ششدر رہ جاتا ہے ' اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں ! لیکن انسان اپنی ذات کے ان عجائبات کو ' جو بے شمار ہیں اور جو ہر شے سے زیادہ عمیق ' زیادہ دقیق اور بے مثال ہیں ' بھولے ہوئے ہے ۔

انگلش کا ' سائنس کا ایک میگزین رقم طراز ہے:

"ہاتھ فطرت کے عجائبات میں سے سب سے زیادہ حیرت ناک اور بالکل منفرد نوعیت کا عضو ہے ۔ یہ بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا آلہ ایجاد کیا جا سکے جو ہاتھ کی طرح سادہ ' بہت سے کاموں پر قادر اور تیزی سے کام کرنے والا ہو ۔ آپ کسی کتاب کو پڑھنا چاہیں تو اسے اپنے ہاتھ سے تھامیں گے ' پھر آپ کتاب کو اس پوزیشن میں رکھیں گے جو پڑھنے کے لیے موزوں ترین ہو ' ہاتھ خود بخود کتاب کو اس پوزیشن میں لے آئے گا ! آپ کتاب کے اوراق پلٹنا چاہیں تو ہاتھ کی انگلی ورق پر رکھیں گے اور اسے اتنا دبائیں گے کہ ورق پلٹ سکے ' ورق پلٹنے پر انگلی کا دباؤ ختم ہو جائے گا ۔ اسی ہاتھ سے آپ قلم پکڑتے ہیں اور ہاتھ قلم سے لکھنے کا کام لیتا ہے ۔ اسی ہاتھ سے ان تمام اوزاروں کو ' جو انسان کے لیے ضروری ہوتے ہیں --- چمچہ اور چھری سے لے کر قلم تک --- استعمال میں لایا جاتا ہے ۔ ہاتھ ہی کھڑکی کھولتا اور بند کرتا ہے ' ہاتھ ہر وہ چیز اٹھاتا ہے جسے انسان اٹھانے کا ارادہ کرتا ہے ۔ آدمی کا یہ ہاتھ ستائیس ہڈیوں اور انیس عضلات کے مجموعہ پر مشتمل ہے ۔

"انسانی کان کا ایک حصہ (درمیانی) تقریباً چار ہزار باریک گتھی ہوئی کمانوں کا ' جو حجم اور شکل کے اعتبار سے بہت عمدہ طور پر تیار اور مربوط کی گئی ہیں ' سلسلہ ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کمانیں موسیقی کے آلات کے مشابہ ہیں ' واضح طور پر انھیں اس مقصد کے لیے تیار کیا گیا ہے کہ ہر طرح کی آواز اور

شور کو بجلی کے کڑکے سے لے کر درختوں کی سرسراہٹ اور آرکسٹرا میں موسیقی کے آلات سے پھوٹنے والے خوش آیند نغموں تک ہر آواز کو دماغ تک منتقل کر دیں"۔

"آنکھ میں دیکھنے کے حاسہ کا مرکز روشنی کو اخذ کرنے والے تیرہ کروڑ پردے رکھتا ہے۔ پھر آنکھوں کی حفاظت کے لیے پپوٹے ہیں جو پلکوں والے ہیں' یہ پپوٹے دن رات آنکھوں کی حفاظت کرتے ہیں' ان کی غیرارادی حرکت گرد و غبار اور اجنبی چیزوں کو آنکھ میں پڑنے نہیں دیتی۔ پلکوں کے سائے کے باعث آنکھوں پر پڑنے والی دھوپ کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ پپوٹوں کی حرکت سے آنکھوں کی حفاظت کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آنکھ خشک نہیں ہونے پاتی۔ رہا وہ سیال مادہ جو آنکھ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور جسے ہم "آنسو" کے نام سے جانتے ہیں تو وہ آنکھ کو پاک صاف رکھنے والا سب سے طاقت ور سیال ہے"۔

"چکھنے کا آلہ انسان میں زبان ہے۔ زبان بہت سے چکھنے والے خلیوں کے ذریعہ' جو زبان کے غشائے مخاطی (لعاب دار پردہ) کی گھنڈیوں میں ہوتے ہیں' اپنا کام کرتی ہے۔ ان گھنڈیوں کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں' ان میں سے کچھ ریشہ دار ہوتی ہیں' کچھ کگر متا ٹائپ کی اور کچھ محدب شکل کی۔ انھیں زبان کے نگلنے اور چکھنے والے پٹھوں کی شاخوں سے غذا ملتی ہے۔ کھاتے وقت چکھنے والے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور ان کے اثرات دماغ تک منتقل ہوتے ہیں۔ یہ نظام منہ کے ابتدائی حصہ میں ہے تا کہ جس چیز کو انسان مضر محسوس کرے اسے تھوکنا ممکن ہو سکے۔ اسی حصہ سے تلخی' شیرینی' سردی' گرمی' ترشی' نمکینی اور سوزش وغیرہ کا احساس ہوتا ہے۔ زبان میں چکھنے کی نو ہزار باریک گھنڈیاں ہوتی ہیں جو ایک سے زیادہ پٹھے کے ذریعہ دماغ سے متعلق ہیں۔ یہ پٹھے کتنے ہیں' ان کا کیا حجم ہے' یہ الگ الگ کیسے عمل کرتے ہیں' اور کیسے مل کر دماغ کو احساسات بہم پہنچاتے ہیں! (سخت حیرت انگیز ہے یہ معاملہ!)"

"اعصاب کا نظام' جو جسم پر مکمل طور سے چھایا ہوا ہے' لمبی باریک نسیجوں سے تشکیل پاتا ہے جو جسم کے تمام اطراف سے گزرتی ہیں' پھر یہ اپنے سے بڑی نسیجوں سے جڑ جاتی ہیں اور وہ اعصاب کے مرکزی نظام سے۔ جب جسم کا کوئی حصہ متاثر ہوتا ہے' خواہ یہ تاثر فضا کے درجہ حرارت میں معمولی تبدیلی ہی کی وجہ سے ہو' تو یہ عصبی نسیجیں اس احساس کو ان مراکز تک پہنچا دیتی ہیں جو پورے جسم میں پھیلے ہوئے ہیں اور مراکز اس احساس کو دماغ تک منتقل کر دیتے ہیں تاکہ دماغ جو اقدام کرنا چاہے کر سکے۔ اعصاب کے ان اشارات و پیغامات کی ترسیل کی رفتار ایک سیکنڈ میں سو میٹر ہے"

"جب ہم ہضم پر اس طرح غور کرتے ہیں کہ وہ ایک کیمیاوی معمل (laboratory) کا ایک عمل

ہے اور جو کھانا ہم کھاتے ہیں، وہ اس کا خام مواد ہے تو ہمیں اچانک یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ ایک حیرت ناک عمل ہے جو تقریباً ہر کھائی ہوئی چیز کو ہضم کر لیتا ہے بجز معدے کے!"

"ہم اس کیمیائی معمل میں انواع و اقسام کے کھانے رکھ دیتے ہیں اور اس میں اس کیمیائی معمل کا کوئی لحاظ نہیں کرتے، اور نہ اس پر غور کرتے ہیں کہ ہضم کا کیمیاوی عمل کس طرح اس سے معاملہ کرے گا، مثلاً ہم گوشت کے ٹکڑے، کرم کلا، گیہوں اور تلی ہوئی مچھلی کھاتے ہیں اور کچھ پانی کے ساتھ انھیں معدہ میں اتار دیتے ہیں"۔

"اس مخلوطہ میں سے معدہ ان چیزوں کا انتخاب کر لیتا ہے جو کار آمد اور نفع بخش ہوتی ہیں۔ وہ ہر قسم کے کھانے کی اس طرح شکست و ریخت کرتا ہے کہ وہ اپنے کیمیاوی اجزا میں تحلیل ہو جائے۔ وہ فضلات کی پرواہ نہیں کرتا۔ بقیہ کو وہ نئے پروٹین میں تبدیل کر دیتا ہے تاکہ وہ مختلف خلیات کے لیے غذا کا کام دے سکے۔ آلہ ہضم اس میں سے کیلشیم، گندھک، آیوڈین، لوہے اور دوسرے ضروری اجزا کو چن لیتا ہے۔ وہ اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ جو ہری اور بنیادی اجزا ضائع نہ ہونے پائیں، ہارمون پیدا ہو سکیں، اور زندہ رہنے کے لیے تمام زندگی بخش ضروری مواد صحیح اور موزوں مقدار میں فراہم ہو سکے جو تمام ضروریات کی تکمیل کے لیے کافی ہو۔ اس کے علاوہ معدہ چربی اور دوسرے احتیاطی مواد کا ذخیرہ بھی کرتا ہے تاکہ کسی ہنگامی ضرورت مثلاً بھوک وغیرہ کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اور یہ سب اس کے بغیر ہوتا رہتا ہے کہ انسان اس کی فکر کرے یا اس کے اسباب و علل معلوم کرے!

ہم بے شمار قسم کی چیزیں اس کیمیاوی معمل میں ڈالتے رہتے ہیں اور اس کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ہم کس قسم کی چیزیں لے رہے ہیں۔ ہمیں اعتماد ہے کہ معدہ ہمیں زندہ رکھنے کے لیے سارے کام خود بخود انجام دے گا۔

جب کھائی ہوئی چیزیں تحلیل ہو کر نئی اشیا کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو ان تیار شدہ اشیا کو جسم کے کھربوں خلیات میں سے ہر خلیہ تک مسلسل پہنچایا جاتا رہتا ہے۔ کل روئے زمین پر انسانوں کی جتنی تعداد ہے ان سے بہت زیادہ تعداد جسم کے خلیات کی ہے۔ ہر ہر خلیہ تک ان اشیا کا مسلسل پہنچتے رہنا ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کسی بھی خلیہ تک اس مواد کے سوا دوسرا مواد نہ پہنچے جس کی اسے ہڈی، ناخن، گوشت، بال، آنکھ، دانت وغیرہ چیزوں میں بدل جانے کے سلسلے میں ضرورت ہے۔ اور ہر مخصوص خلیہ یہ مواد مسلسل پاتا رہتا ہے۔

معدہ ایک ایسا کیمیاوی معمل ہے جو انسانی ذہن کی ایجاد کردہ کسی بھی لیبارٹری سے زیادہ مواد فراہم کرتا ہے۔ پھر اسی کے ساتھ ترسیل کا ایک ایسا نظام ہے، جو حمل و نقل اور ترسیل کے کسی بھی نظام سے، جسے دنیا جانتی ہے، زیادہ عظیم ہے اور یہ سارا کام انتہائی نظم و ضبط اور منصوبہ کے ساتھ

انجام پاتا ہے"۔

(الله و العلم الحدیث ' خدا اور جدید سائنس مصنف استاذ عبدالرزاق نوفل اور العلم یدعو الی الایمان ' سائنس ایمان کی طرف بلاتی ہے)۔

انسانی جسم کے دوسرے نظاموں میں سے ہر ایک نظام کے بارے میں اسی طرح بہت کچھ بتایا جاتا ہے ' لیکن ان نظاموں میں خدا کے کھلے ہوئے اعجاز کے باوجود حیوانات کسی نہ کسی صورت میں انسان کے شریک ہیں۔ جو چیز ان کے علاوہ انسان میں پائی جاتی ہے وہ اس کی عقلی و روحانی خصوصیات ہیں جن میں وہ منفرد ہے! اس سورہ میں یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ -- اے انسان -- کے الفاظ سے پکارنے کے بعد اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ "جس نے تجھے پیدا کیا! تجھے ٹھیک ٹھاک کیا! اور تجھے معتدل و متناسب بنایا" کہہ کر دراصل انھی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انھیں اللہ کا خصوصی انعام و احسان قرار دیا گیا ہے!

عقل کا یہ فہم و ادراک ' جو انسان کے ساتھ خاص ہے ' ہم اس کی کنہ سے ناآشنا ہیں۔ جن چیزوں کو ہم جانتے ہیں ' انھیں جاننے کے لیے عقل ہی آلہ ہے لیکن عقل خود اپنے آپ کو نہیں جانتی ' نہ یہ جانتی ہے کہ وہ کس طرح جانتی ہے۔ عقل کے ذریعہ جن چیزوں کا ادراک ہوتا ہے ' ہم فرض کرتے ہیں کہ ان کے متعلق معلومات باریک عصبی نسیجوں کے ذریعہ دماغ تک پہنچتی ہیں لیکن دماغ ان محسوسات و معلومات کو کہاں ذخیرہ کرتا ہے؟ مغز کو اگر ایک ریکارڈ کرنے والا فیتہ مان لیا جائے تو انسان کی ساٹھ سال کی عمر کے لیے جو اس کی اوسط عمر ہے --- اربوں میٹر لمبا فیتہ درکار ہوگا جس میں اس مدت کی صورتوں ' باتوں ' معانی ' محسوسات اور تاثرات کے عظیم ذخیرے کو ریکارڈ کیا جاسکے تاکہ بعد میں اسے یاد کیا جاسکے ' جیسا کہ دسیوں سال کے بعد انسان کو عملاً یہ باتیں یاد آجاتی ہیں۔ پھر دماغ کس طرح مفرد الفاظ ' مفرد معانی ' مفرد واقعات اور مفرد ضرورتوں کو ترکیب دے کر ان سے ایک مجموعی فہم حاصل کرتا ہے تاکہ معلومات سے علم کی طرف ' محسوسات و مدرکات سے ادراک کی طرف اور تجربات سے معرفت کی طرف پہنچا جاسکے!

یہ انسان کی ان خصوصیات میں سے ' جو اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں ' ایک خصوصیت ہے لیکن یہ اس کی سب سے بڑی اور سب سے اعلیٰ و ممتاز خصوصیت نہیں ہے۔ اس سے بھی اعلیٰ ایک اور شے ہے اور وہ انسانی روح ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے اور جو اللہ کی روح کا ایک نور اور پرتو ہے۔ یہ روح انسان کا ' وجود اور خالق وجود کے حسن و جمال سے ربط قائم کر دیتی ہے اور انسان کائنات کے حسن و جمال کے انوار کو جذب کرنے کے بعد وجود مطلق سے --- جو بے حد و بے انتہا ہے --- رابطہ کے تاب ناک و لطیف لمحات و کیفیات سے ہم کنار ہوتا ہے!

انسان اس روح کی کنہ سے ناواقف ہے! وہ تو اس سے کم تر درجہ کی شے کو بھی نہیں جانتا! یعنی محسوسات و مدرکات کے فہم و ادراک کی حقیقت کو --- انسان زمین پر رہتے ہوئے اس روح کی بدولت آسمانی سعادت و مسرت کے انوار سے متمتع ہوتا ہے اور اس کا رابطہ ملا اعلیٰ سے قائم ہو جاتا ہے۔ یہ روح انسان کے اندر جنت کی دائمی و ابدی زندگی سے متمتع ہونے اور سعادتوں سے بھرے اس عالم میں خدائی حسن و جمال دیکھنے کی استعداد پیدا کرتی ہے۔

یہ روح انسان کے لیے اللہ کی سب سے بڑی بخشش ہے، اسی کی وجہ سے وہ "انسان" بنا ہے، اسی وجہ سے اللہ نے اسے یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اے انسان! کہہ کر پکارا ہے۔

پھر خدائے تعالیٰ اسے عتاب کرتا ہے! شرمندہ کرنے والا عتاب! مَاغَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ "کس شے نے تجھے اپنے رب کریم کے بارے میں فریب میں مبتلا کر رکھا ہے!"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسان کو آواز دے کر بہ نفس نفیس اس پر عتاب کرتا ہے! اور انسان کا حال کیا ہے؟ وہ قصور وار، گناہ گار، فریب خوردہ، خدائی عظمت و جلال کا قدر ناشناس، اس کے حضور میں بے ادب بنا کھڑا ہے! اللہ تعالیٰ اسے اپنی سب سے بڑی نعمت --- انسانیت --- یاد دلاتا ہے، پھر اس کی تقصیر، بے ادبی اور فریب خوردگی کا ذکر کرتا ہے!

یہ انسان کو پگھلا دینے والا عتاب ہے بشرطیکہ انسان اپنے وجود کے نقطہ آغاز کی حقیقت سے واقف ہو، اپنے خبر دینے والے کی حقیقت سے آگاہ ہو اور اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے کی حقیقت سے باخبر ہو --- ہاں خدا انسان کو پکار رہا اور اسے عتاب کر رہا ہے!

یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَاغَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ - اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ - فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّاشَآءَ رَکَّبَکَ -

"اے انسان! کس شے نے تجھے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے! جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے ٹھیک ٹھاک کیا، تجھے معتدل و متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا، جوڑ کر تجھے تیار کیا"۔ (فی ظلال القرآن)

کوالٹی آف لائف

اس دنیا کی مختصر سی غیر یقینی زندگی میں ـــــ

کوالٹی آف لائف کی خاطر

ہم کتنی احتیاطیں کرتے ہیں!

بلڈ پریشر ہو تو نمک نہیں چکھتے، ذیابیطس ہو تو شکر،

دل کا حملہ ہو جائے تو معمولات زندگی ہی بدل جاتے ہیں۔

کبھی بعد کی نہ ختم ہونے والی یقینی زندگی کی

کوالٹی آف لائف کے بارے میں سوچا؟

نافرمانی کرنے پر، ہاتھ پاؤں اور آنکھوں سے گناہ کرنے پر ـــ

غیبت کرنے، ناجائز مال کمانے اور حق مارنے پر ـــ

کیسی کیسی وعیدیں ہیں!

پھر ہم کیوں نہیں بچتے؟

کیا ہم کو یقین نہیں ـــــ

اتنا بھی نہیں جتنا ڈاکٹر کی بات پر ہے۔

اسلامی قانون - ایک عمومی تعارف

محمود احمد غازی

اواخر مارچ ۱۹۹۶ میں اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور کی دعوت پر ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اسلام کے قانون بین الممالک کے چند پہلوؤں پر بارہ خطبات دیے۔ ان خطبات کی تدوین کا کام جاری ہے۔ مکمل ہونے پر ان شاء اللہ کتابی صورت میں اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور سے شائع ہوں گے۔ اس سلسلہ کا پہلا خطبہ اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور کی اجازت سے شائع کیا جارہا ہے۔ (مدیر)

اس دور میں اسلامی قانون عام طور پر اور اسلام کا قانون بین الممالک خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بڑی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوگئے ہیں۔ آج مسلمانوں کی بقا اور دنیائے اسلام کی آزادی کے تحفظ کا دارومدار بڑی حد تک ان کی فہم شریعت پر ہے۔ آج جو طرز عمل وہ فقہ اسلامی کے بارے میں اختیار کریں گے وہ آیندہ آنے والے بہت سے فکری، ثقافتی اور تہذیبی مسائل میں ان کے رویے کا تعین کرے گا۔ آج دنیائے اسلام ایک غیر معمولی فکری کشمکش سے گزر رہی ہے جس کا سب سے بڑا محور اسلامی قانون کے بنیادی تصورات اور اساسی اصول ہیں۔ اگر دنیائے اسلام کامیابی کے ساتھ اس کشمکش سے گزر گئی تو خوش آیند مستقبل، باوقار آزادی اور اقوام عالم میں قائدانہ اور معلمانہ کردار اس کے منتظر ہیں۔ بصورت دیگر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کشمکش اور کتنی طویل ہوگی اور کہاں جاکر ٹھہرے گی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ آج سے تقریباً پچھتر سال پہلے علامہ اقبال نے اسلامی قوانین پر غور خوض کی ضرورت کا احساس کیا۔ انھوں نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام ایک خط (۱۹۲۵) میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کے لیے یہ بڑا نازک دور ہے اور مذہب اسلام زمانے کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے۔ مسلمان یا تو اپنی آزادی و بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں یا اسلامی قوانین پر غور کر رہے ہیں۔ پھر علامہ اقبال نے لکھا کہ میرے خیال میں اس زمانے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ دور جدید کے اصول قانون پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام اسلام کی ابدیت کو ثابت کیا جائے اور جو شخص اس کام کو کرے گا وہ میرے نزدیک اس دور کا مجدد ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی نظر میں پاکستان بننے سے تقریباً

۳۰ سال پہلے' اسلامی قوانین پر غور و فکر اور تحقیق کا کام کتنی اہمیت رکھتا تھا اور وہ برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کے بعد پیش آنے والے مسائل و معاملات پر کتنی گہرائی سے غور کر رہے تھے۔ علامہ اقبال کی مختلف تحریروں اور بیانات میں ان خطوط کی طرف اشارے بھی ملتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ اسلامی قوانین پر غور کرنا چاہتے تھے۔ آج ہماری من حیث القوم یہ ذمہ داری ہے کہ ہم علامہ اقبال کے افکار و تجاویز کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسا نقشہ کار وضع کریں جس سے کام لے کر اسلامی قوانین کا نفاذ کیا جاسکے اور دور جدید کے انسان ساختہ قوانین پر ان کی برتری ثابت کی جاسکے۔

دور جدید کے وہ مسلم دانش ور اور محققین جو اسلامی قانون اور فقہ سے واقفیت رکھتے ہیں' اور جن کو اللہ نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ دور جدید کے اصول قانون اور تصورات قانون پر نگاہ ڈال سکیں ان کی آج یہ ملی اور اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ احکام اسلامیہ کی ابدیت کو ثابت کریں اور دور جدید کے تصورات کی روشنی میں دنیا کو یہ بتائیں کہ اسلام کے قوانین ہی انسان کے درد کا مداوا ہیں۔ ایک صحیح الخیال مسلمان جس کو اس بات کا مکمل یقین ہے کہ اسلام ہی اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے' جس کو اس بات پر شرح صدر حاصل ہے کہ اسلام کا قانون ہی انسان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل ہے اور جو ہر دور میں اسلامی شریعت کی معنویت اور صلاحیت پر کامل ایمان رکھتا ہے۔ اس کے لیے تو معاملہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے جو توجہ دلائی ہے وہ ان لوگوں کو مطمئن کرنے اور قائل کرنے کے لیے ہے جن کا اسلام پر ایمان یا تو ہے نہیں یا کمزور ہو چکا ہے' جو اسلام پر یا تو کاربند نہیں ہیں یا اسلام سے ان کی وابستگی بہت کمزور ہو چکی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے اسلام کے تصور حیات' پیغام' تعلیمات اور قوانین کو اس انداز میں پیش کرنا کہ وہ دور جدید میں احکام اسلامیہ کی ابدیت پر پوری طرح مطمئن ہو جائیں' وقت کی سب سے بڑی علمی اور فکری ضرورت ہے۔ یہ درحقیقت ایک مجددانہ کام ہے جو پوری دنیا کے مسلمانوں کا بالعموم اور پاکستانیوں کا بالخصوص ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ کیونکہ پاکستان ہی کے مصور اور پاکستان ہی کے فکری بانی اور مؤسس نے اس کی اہمیت کو سب سے پہلے محسوس کیا تھا اور اس کی طرف توجہ دلائی تھی۔

اسلامی قوانین کی ایک دوسری اہمیت بھی ہم پاکستانیوں کی ملی اور اجتماعی زندگی کے لیے خاص طور پر اور دنیائے اسلام کی ملی اور اجتماعی زندگی کے لیے عام طور پر محسوس کی جارہی ہے اور وہ یہ ہے کہ آج مسلمان اپنے بقا اور تشخص کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دنیا میں ہر جگہ عالم گیر قوتیں ان کے تشخص کو مٹانے کے درپے ہیں۔ اور مسلمانوں کو ایک عالمی نظام میں اس طرح سمو لینے کی کوششیں ہو رہی ہیں کہ مسلمانوں کو یہ محسوس ہی نہ ہو سکے کہ ان کا تشخص کہاں کہاں مجروح ہوا ہے اور کیسے کیسے ان کے جسد ملی کو تار تار اور بے زبان و بے لباس کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ آج مسلمانوں کی تاریخ پر

حملے کیے جا رہے ہیں، مسلمانوں کے اقتدار کو مغربی طور طریقوں اور ان کی ثقافت کو تنقیدی حملوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وہ علاقے، وہ تہذیبیں اور وہ ممالک جو آزادی رائے رکھتے ہیں، اور آزادی گفتار کا مرکز سمجھے جاتے ہیں، جہاں سے جدید مغربی انقلاب کا آغاز ہوا، جس کا بنیادی نعرہ ہی آزادی، مساوات اور برابری تھا۔

آج وہاں مسلمان بچیوں کو سر پر چادر ڈالنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے محسوس کر لیا ہے کہ یہ چھوٹی سی چیز، جس کو چاہے اسلامی دنیا میں زیادہ اہمیت کا حامل نہ سمجھا جا رہا ہو، ایک بہت بڑے انقلاب اور تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ان کے خیال میں پیرس کی ایک نواحی بستی میں اگر ایک مسلمان بچی اس پر اصرار کرتی ہے کہ وہ سر ڈھک کر سکول جائے گی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کو اپنے تشخص اور انفرادیت کا احساس ہو چلا ہے جو آگے چل کر دوسرے پہلوؤں میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔

آج مغرب کو جو چیز سب سے زیادہ خطرہ کا باعث محسوس ہو رہی ہے وہ اسلام کا قانون اور مسلمانوں کی شریعت اور نظام حکومت ہے۔ پچھلے پچاس برسوں کے دوران مغرب کے مفکرین نے اسلامی قوانین اور شریعت پر جو کچھ لکھا ہے اس کی بنیادی اسپرٹ اور روح یہ رہی ہے کہ دنیا کو یہ باور کرا دیا جائے کہ اگر اسلامی قوانین ایک بار پھر اسلامی دنیا میں کارفرما ہو گئے تو اس سے مغرب کی تہذیبی اور فکری بالادستی کو ٹھیس پہنچے گی لہٰذا اپنی بالادستی کے تحفظ کی خاطر بالادست مغربی قوتوں کی کوشش غیر شعوری اور شعوری دونوں طرح سے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی قوانین سے دور رکھا جائے اور ان کے بارے میں ایسی غلط فہمیاں پیدا کر دی جائیں کہ مسلمان اس سے دور ہوتے چلے جائیں۔

ان حالات میں اسلامی قوانین پر بالعموم اور اسلام کے بین الاقوامی قوانین پر بالخصوص مسلمانوں کو سنجیدگی اور ذمہ داری سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بین الاقوامی قوانین پر غور کرنے کی ضرورت خاص طور پر اس لیے ہے کہ آج دنیا کے لیے نئے نظام تشکیل دیے جا رہے ہیں، بین الاقوامیت کا دور دورہ ہے، ہر چیز میں ایک قسم کی عالم گیریت پیدا ہو رہی ہے۔ مغربی دنیا بھی اس کرۂ ارض پر اپنی بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے ایک نیا ورلڈ آرڈر تشکیل دے رہی ہے۔ جس کے لیے ایک نیا عالم گیر نظام، نئی عالمی تہذیب اور سیاست و معیشت کے نئے نقشہ ہائے کار ترتیب دیے جا رہے ہیں۔

مغربی دنیا محسوس کرتی ہے کہ اس کو نیا عالمی نظام بنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر کسی قوم یا تہذیب کے پاس پہلے سے بنا بنایا نظام موجود ہو، بین الاقوامی تعلقات، بین الاقوامی قانون، لین دین اور بین الاقوامی میل جول کا پورا نظام پہلے سے موجود ہو، اس کو ظاہر ہے کہ از سر نو کسی نظام کی تشکیل کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ایسی کسی قوم یا تہذیب کی یہ ذمہ داری ضروری ہے کہ وہ زمانے کے

تغیرات اور تقاضوں کو پیش نظر رکھے اور ہر دور کی زبان اور محاورہ بیان میں اپنے تصورات کو پیش کرتی رہے ۔ آج ہماری یہی ذمہ داری ہے کہ ہم اسلام کے عالمی نظام کے بنیادی تصورات کو دور جدید کے سیاق میں سمجھنے کی کوشش کریں ' بلکہ اس دور کی زبان میں ان تصورات کو پیش کریں اور اس دور کے تصورات پر تحقیقی نگاہ ڈال کر احکام اسلامیہ کی ابدیت کو ثابت کریں ۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں اسلامی قانون ایک کلی نظام ہے ۔ یہ ایک ایسا مکمل نظام قانون ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اصول و ہدایات دیتا ہے ۔ یہ ملکی ' ریاستی ' قومی اور بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں اپنے طے شدہ اور واضح تصورات رکھتا ہے ۔ لیکن جب تک یہ تمام چیزیں ضروری تفصیلات اور عملی مثالوں کے ساتھ ہمارے سامنے نہ آ جائیں اس وقت تک ہمارے لیے یہ فرض کر لینا درست نہیں ہو گا کہ دنیا نے اسلام کو بطور ایک مربوط اور قابل عمل نظام زندگی کے تسلیم کر لیا ہے ۔ جب تک ہم دور جدید کے مغرب زدہ اور لادینیت گزیدہ دانشور کو عقلی دلائل سے اس بات پر مطمئن نہیں کر دیں گے کہ اسلام کا قانون سچ مچ انسانوں کے مسائل و مشکلات کو حل کر دیتا ہے اس وقت تک ہم خود اسلامی ممالک میں بھی اسلامی قوانین کے نفاذ کی راہ میں کوئی پیش رفت نہ کر سکیں گے ۔ ہمیں عام مسلمانوں ' روایتی ایمان اور رواجی عقائد و اعمال پر بھروسہ کر کے نہیں بیٹھ جانا چاہیے ۔ یہ فرض کر لینا کہ آج کا ایک عام مسلمان اسلام کی ابدیت اور اسلامی قانون کی صلاحیت و عملیت کا اسی طرح قائل ہے جس طرح ایک صاحب ایمان کو ہونا چاہیے ' ایک خطرناک اور تباہ کن مفروضہ ہے ۔

یہ دور تاریخ اسلام کا نازک ترین دور ہے ۔ آج مختلف ذرائع سے دنیائے اسلام پر حملے ہو رہے ہیں ۔ پبلسٹی اور پروپیگنڈے کا ایک طوفان ہے جو دنیائے اسلام کے خلاف کھڑا کر دیا گیا ہے ۔ یہ دور معلومات کی وسعت اور نت نئے انکشافات کے انفجار (explosion) کا دور ہے ۔ انفجار معلومات کی جتنی شکلیں انسانوں کے تصور میں آ سکتی ہیں وہ سب اس دور میں استعمال کی جا رہی ہیں ۔ آج سے پچاس سال قبل لوگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ معلومات و اطلاعات اس تیز رفتاری کے ساتھ ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل کی جا سکتی ہیں جتنی وسعت کے ساتھ آج منتقل ہو رہی ہیں ۔ آج ایک مغربی ملک میں ایک مفکر ایک نظریہ پیش کرتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پورے کرہ ارض کے علمی حلقوں میں بحث و تمحیص کا موضوع بن جاتا ہے ۔ آج ایک بڑی طاقت کا سربراہ نئے عالمی نظام کا ذکر کرتا ہے اور دنوں یا ہفتوں میں نہیں گھنٹوں کے اندر اندر وہ دنیا بھر کی سیاسیات کا سب سے اہم عنوان قرار پا جاتا ہے ۔

اس صورت حال سے دنیائے اسلام بھی متاثر ہو رہی ہے ۔ آج پاکستان کی ایک ماتحت عدالت

میں ایک غیر مسلم کے خلاف ملکی قانون کے تحت ایک مقدمہ دائر ہوتا ہے اور چند دنوں کے اندر اندر وہ دنیا کے اخبارات اور ذرائع ابلاغ کی خبروں اور فیچروں کی سب سے اہم خبر بن جاتا ہے یا بنا دیا جاتا ہے۔ ایک عدالت نے دو غیر ملکیوں کو قانون کے مطابق سزا ہوتی ہے اور روئے زمین کے ہر گوشہ سے اتنا شدید ردعمل سامنے آتا ہے کہ کمزور ایمان مسلمان اور کمزور تخت و تاج والے حکمران اندر سے حیران و پریشان اور باہر سے لرزاں و ترساں نظر آتے ہیں۔ایک مسلم ملک میں ایک عالم دین ایک بات کہتا ہے اور دنیا اس طرح ہل جاتی ہے جیسے کوئی خستہ حال عمارت زلزلہ کا شکار ہوگئی ہو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ آج کا دور محدودیت کا دور نہیں ہے۔ آج کا دور کسی انغلاق کا دور نہیں ہے کہ کوئی قوم اپنے کو کسی خول میں بند کر کے یہ سمجھنے لگے کہ وہ اپنے کو محفوظ کر لینے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ آج کا دور تفتح کا دور ہے۔ دنیا کی ہر قوم اپنے دروازے اور کھڑکیاں دوسروں کے لیے کھول دینے پر مجبور ہے۔سوویت یونین جیسی دہشت انگیز طاقت تک کے آہنی پردے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کا یہ سمجھ لینا کہ ہم دنیا سے آنکھیں بند کر کے دنیا کی آنکھیں بھی بند کر دیں گے درست نہیں ہے۔ آج مسلمان جو کچھ کریں گے اس کے اثرات پوری دنیا پر ہوں گے۔ آج مسلمان جو کہیں گے وہ ساری دنیا میں سنا جائے گا۔ اور اس پر موافقانہ اور مخالفانہ دونوں انداز سے رائے زنی ہوگی۔جو پالیسیاں آج دنیائے اسلام میں اختیار کی جائیں گی ان کا مثبت اور منفی دونوں طرح کا ردعمل فوراً سامنے آئے گا۔ مسلمان اہل دانش آج جس طرح سوچیں گے اس کے اثرات فوراً ہی کرۂ ارض پر محسوس ہوں گے۔

ان حالات میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمیں ہر ہر مید ان میں بڑی احتیاط اور انتہائی غور و فکر اور گہرے تدبر کی ضرورت ہے۔ ہمیں کسی بھی سمت کوئی بھی پیش قدمی کرتے وقت ہزار بار سوچ لینا چاہیے۔یہاں میں ایک بار پھر علامہ اقبال کے الفاظ دہراتے ہوئے کہوں گا کہ اس وقت مذہب اسلام بین الاقوامی سطح پر حالات و زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ آج کا سکہ رائج الوقت بازار اسلام میں قابل قبول نہیں اور سکہ اسلام بازار وقت میں کار آمد معلوم نہیں ہوتا۔ آج جن نظریات کا چلن ہے وہ اسلامی عقائد و نظریات سے متصادم ہیں۔ دوسری طرف ہم جن احکام و تعلیمات پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں، ان کو دور جدید کا ذہن قبول نہیں کرتا۔اس کے ذہن کی ساخت ایسی بن چکی ہے یا بنا دی گئی ہے کہ اس میں اسلامی تعلیم ایک اجنبی اور اوپری چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ آج زندگی کا کون سا گوشہ ایسا رہ گیا ہے جس کے بارے میں اسلام کا موقف سمجھنے اور مان لینے میں خود مسلمانوں کو الجھنیں نہ پیش آرہی ہوں۔

خود پاکستان کی مثال لے لیں۔ یہاں ۱۹۷۹ میں حدود کے قوانین نافذ ہوئے تو ایسے بہت سے

لوگوں نے جن میں کئی خواتین بھی شامل تھیں، ان پر ایسے ایسے اعتراضات کیے جن کی توقع کسی مسلمان سے ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ انگریزی قانون سے مانوس اور اسلامی تصورات سے عقلاً نامانوس اور علمی طور پر ناواقف ہونے کی وجہ سے بعض ایسی باتیں کہی گئیں جن کو سن کر سوائے اناللّٰہ پڑھ لینے کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ حدود کے نفاذ سے قبل پاکستان کے فوج داری قانون میں بدکاری اگر باہمی رضامندی سے ہو تو جرم نہ تھی۔ اگر بدکاری کے مرتکبین شادی شدہ بھی ہوں اور متعلقہ فریقین کے زوجین کو اعتراض نہ ہو تو انگریزی شریعت کی رو سے یہ ایک جائز فعل تھا۔ جن صورتوں میں تعزیرات پاکستان نے بدکاری کو جرم قرار بھی دیا تھا وہاں صرف مرد کو مجرم گردانا گیا تھا، عورت مجرم نہ تھی۔ جب قوانین حدود کی رو سے عورتوں اور مردوں کو بدکاری کی ہر صورت میں مجرم قرار دیا گیا تو اس کو خواتین کے ساتھ زیادتی قرار دیا گیا۔ اسی طرح کے اعتراضات حدود کے دوسرے قوانین پر بھی کیے گئے، تزکیۃ الشہود کے اصول کو ناقابل عمل بتایا گیا، عادل گواہ کی شرائط کی اخباری مضامین میں تضحیک کی گئی، سزائے تازیانہ کو انسانیت کی توہین قرار دیا گیا، قطع ید کی سزا پر عمل درآمد کے سلسلہ میں مضحکہ خیز اور افسوسناک شبہات اٹھائے گئے۔

۱۹۸۴ میں قانون شہادت آرڈر کے نفاذ اور اس سے پہلے مجوزہ قانون شہادت کی دفعات پر اعتراضات کے وہ وہ طوفان اٹھائے گئے جو قبل ازاں شاید غیر مسلمانوں نے بھی نہ اٹھائے ہوں۔ یہی حال ۱۹۹۰ کے قصاص و دیت آرڈیننس اور قانون توہین رسالتؐ کے ساتھ ہوا۔ قبل ازیں ایسے ہی اعتراضات امتناع قادیانیت آرڈیننس کے بارے میں اٹھائے گئے تھے۔ یہاں ان سب اعتراضات کو دہرانا تو ممکن نہیں ہے جو ایک حلقہ کی طرف سے ان قوانین پر کیے گئے، لیکن ان سب میں جو بات قدر مشترک تھی، وہ یہ تھی کہ اعتراضات کرنے والوں میں ہمارے ملک کے سیکولر طبقہ کے ساتھ یہاں کے بعض اقلیتی مذہبی لیڈر اور مغربی ذرائع ابلاغ مکمل طور پر ہم آواز تھے۔ ان قوانین کو جس زاویہ نگاہ سے ایک ہندو لیڈر دیکھ رہا تھا اسی زاویہ نگاہ سے ایک مغربی تعلیم یافتہ پاکستانی مسلمان بھی دیکھ رہا تھا۔ ان قوانین کے بارے میں جو رائے ایک عیسائی لیڈر کی تھی وہی ہماری بعض مغرب زدہ خواتین کی بھی تھی۔ ان قوانین پر جو اعتراضات پاکستان کے روایتی دشمنوں کی طرف سے اٹھائے جا رہے تھے وہی ہمارے بعض اخبارات میں بھی دہرائے جا رہے تھے۔

اس صورت حال کا صرف ایک سبب ہے اور وہ یہ ہے کہ آج ہمارے قانون دان طبقہ میں بالخصوص اور مغربی تعلیم یافتہ طبقہ میں بالعموم اسلامی تصورات اور قانون کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے گہری واقفیت رکھنے والے حضرات خال خال ہی پائے جاتے ہیں۔ وہ جن تصورات سے واقف اور جن نظریات سے مانوس ہیں وہ مغربی لادینی مسیحی تصورات ہیں۔ ان کے ہاں قانون، اور

پوری سیاسی زندگی کا اساسی اصول دین و سیاست کی علاحدگی ہے۔ یہاں یہ بات ایمان و ایقان کا جزو ہے کہ جب دین و دولت میں جدائی ہو تو پھر چارسو، ہوس ہی کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے۔ وہاں تصور یہ ہے کہ ریاست کو کسی اخلاقی نظریہ سے وابستگی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور ایک لااخلاقی (amoral) نقطہ نظر اپنانا چاہیے۔ یہاں ریاست کا مقصد وجود ہی اسلامی اخلاقی کردار کا فروغ اور تحفظ ہے، وہاں قانون کی بنیاد عامتہ الناس، اور درحقیقت بااثر طبقوں کے مفاد اور پسند و ناپسند کو بنایا جاتا ہے۔ یہاں قانون کے جائز ہونے کی واحد بنیاد وحی الٰہی سے ہم آہنگی ہے، وہاں معیار حق و باطل انسانوں کی مادہ پرستانہ عقل ہے۔ جب کہ حق و باطل کا تعین کتاب الٰہی سے ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ تصورات کے ان بنیادی اختلافات کی صورت میں یہ بات فطری ہے کہ مغربی تصورات کے علم بردار اور مغربی نظریات سے مسلح حضرات اسلامی قوانین اور احکام کو قبول کرنے میں تامل کریں اور ان پر اعتراضات کرنے میں اہل مغرب کے ہم آواز ہوں۔ اس صورت حال کو نہ اظہار نفرت سے تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نہ درشت کلامی سے۔ ان حالات میں نہ کوئی فتویٰ اثرانداز ہو سکتا ہے اور نہ اجتماعی نکیر۔ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے ایک بھرپور فکری تحریک کی ضرورت ہے جس کا ایک اہم حصہ اسلامی قوانین اور اصول شریعت کی فکری تشریح اور فلسفیانہ توضیح ہے۔ جب تک سنجیدہ عقلی دلائل سے ان حضرات کو اسلامی عقائد و تعلیمات سے مطمئن نہیں کیا جائے گا محض عامتہ الناس کی جذباتی مذہبیت کی بنیاد پر کوئی دیرپا عمارت تعمیر نہیں کی جا سکے گی۔

آج کا دور اصول و نظریات کی کشمکش اور ثقافتوں اور تہذیبوں کے تصادم کا دور ہے۔ آج نامور مغربی مفکرین اور مورخین زور و شور سے اس فکری کشمکش اور تہذیبی تصادم کی باتیں کر رہے ہیں۔ آج نہ صرف ملکی قوانین اور پالیسیاں بلکہ تعلیم و ثقافت سے لے کر آرٹ اور روزمرہ زندگی کے مظاہر تک سب اس بنیادی تصور زندگی اور نظریہ حیات یعنی نظریہ کائنات weltan schauung سے اس طرح وابستہ ہیں جس طرح کسی درخت کی شاخیں اور پھول اس کی جڑ سے وابستہ ہوتے ہیں۔

آج کے اس نظریہ حیات کا ایک امتیازی وصف مذہب کے معاملہ میں (بظاہر) ایک مکمل غیر جانب داری ہے۔ لیکن درحقیقت آج کے سارے اجتماعی تصورات یا تو مذہب دشمن ہیں یا لامذہبی طرز عمل پر مبنی ہیں یا کم از کم مذہب کے بارے میں غیرجانب داری کے مدعی ہیں۔ اس کا ایک اہم اور لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کا انسان مذہبی عقائد کے بارے میں کسی اجتماعیت کو قبول کرنے میں سخت پس و پیش سے کام لیتا ہے اور مذہب کے معاملہ میں انفرادیت پسندانہ رویہ کو ہی ایک قابل قبول اور قابل برداشت رویہ سمجھتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے لیے یہ رویہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اسلام نہ بدھ بھکشوؤں کی طرح دنیا سے فرار کی تعلیم دیتا ہے اور نہ مسیحیت کی طرح اجتماعی زندگی کو دینی راہ نمائی اور وحی الٰہی کے دائرہ سے خارج کرتا ہے۔ اسلام جہاں مذہبی عقائد و عبادات کا ایک مجموعہ ہے وہاں وہ ایک مکمل اجتماعی پروگرام بھی ہے۔ وہ ایک معاشرتی نظام بھی ہے۔ وہ ایک واضح اور مربوط قانون بھی ہے۔ اس کا اپنا ایک نظام زندگی اور تصور زندگی بھی ہے۔ اس میں ایسی انفرادیت پسندی اور اجتماعیت فراری کا سرے سے کوئی تصور یا امکان موجود نہیں ہے۔ اجتماعی زندگی سے اسلام کو دیس نکالا دینے کا کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک کے بے شمار احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتعداد ارشادات ایسے ہیں جن پر انفرادی طور پر عمل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ صرف ایک اجتماعی نظام میں ہی روبہ عمل آ سکتے ہیں۔ آخر نماز باجماعت، زکوٰۃ، حج اور جہاد سے لے کر معاملات اور کاروبار میں حلال و حرام کی قیود تک کون سے احکام ایسے ہیں جن پر کسی قسم کی اجتماعیت کے بغیر عمل ہو سکتا ہو۔ کیا ایک منٹ کے لیے بھی کوئی مسلمان یہ سوچ سکتا ہے کہ اسلام اسی طرح کا ایک محدود انفرادیت پرست مذہب ہے جس طرح بدھ مت یا مسیحیت مذہب کہلاتے ہیں۔

بلاشبہ اسلام میں فرد کی تربیت اور کردار سازی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ یقیناً اللہ کے حضور ہر انسان انفرادی طور پر ہی جواب دہ ہو گا۔ بے شک انسان اپنے عقائد و عبادات اور نیت و عزائم کے بارے میں خود ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس حد تک اخلاص پر مبنی ہیں، لیکن ان چیزوں کی بنیاد پر اسلام کو کسی طرح بھی سیکولر نظام کا علم بردار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ آج بہت سے مغرب زدہ مسلم مفکرین جب اسلام میں اس طرح کے انفرادی احکام کو دیکھتے ہیں تو وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اسلام کی یہ انفرادیت دوسرے مذاہب کی طرح کی ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ اسلام میں بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کے بارے میں فرد انفرادی طور پر ہی اللہ تعالیٰ کو جواب دہ ہے تو وہ ان معاملات کی تعبیر سیکولرزم کے انداز کی کرنے لگتے ہیں۔ ایسے حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں خالص انفرادی معاملات اور تقاضوں اور فرد کی ذاتی ذمہ داریوں کے علاوہ بھی بہت سے احکام اور تقاضے ہیں۔ اسلام میں دیوانی قوانین بھی ہیں، فوج داری احکام بھی ہیں، دستوری اصول بھی ہیں، انتظامی ہدایات بھی ہیں، بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی سیاست کے ضابطے بھی ہیں، ان سب اصول و ہدایات اور احکام و ضوابط پر عمل درآمد کرنے اور کرانے کے لیے اسلامی ریاست اور اسلامی حکومت کا ہونا بھی ضروری ہے۔

اسلامی تعلیمات کے ان تمام پہلوؤں کو مجموعی طور پر پیش نظر رکھا جائے تو خود بخود یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں ہر شعبہ زندگی میں راہ نمائی فراہم کرنے والے احکام کا ایک جامع مجموعہ

موجود ہے۔ ان میں وہ تمام مثبت پہلو موجود ہیں جو جزوی طور پر دنیا کے دوسرے بہت سے نظاموں میں پائے جاتے ہیں۔ سیکولرزم، مغربی جمہوریت، سوشلزم اور ایسے ہی دوسرے نظاموں میں جزوی طور پر بعض مثبت پہلو یقیناً پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے ان نظاموں کو دنیا کے بڑے بڑے علاقوں اور ممالک میں پذیرائی ملی۔ لیکن ان نظاموں میں ان مثبت پہلوؤں کو محض جزوی اور یک رخے انداز سے لیا گیا ہے، جب کہ اسلام میں وہ ایک مجموعی اور مربوط کل کے اجزا ہیں۔ اسلام نے ایک کلی نظام کی تعلیم دی ہے جو بحیثیت مجموعی انسان کی تمام ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور ان سب کے تقاضوں کی رعایت رکھی ہے۔ اسلام نے مسائل کی جزوی نہیں کلی اور ہمہ گیر اصلاح کی ہے۔ وہ یک رخی نہیں، ہمہ جہت اصلاح کا داعی ہے۔

اس کلی اور ہمہ گیر اصلاح کے لیے ایک کلی اور ہمہ گیر طرز فکر کی ضرورت ہے۔ جب تک انسان کا رویہ ساری کائنات کے بارے میں جامع اور ہمہ جہت نہ ہو گا اس کے لیے کسی جامع اور ہمہ جہت اصلاح کی سمت میں پیش قدمی کرنا ممکن نہ ہو گا۔ یہ کلی اور ہمہ گیر طرز فکر، یہ جامع رویہ، یہ ہمہ جہت اصلاحی طرز عمل اسلام کی اصطلاح میں دین کہلاتا ہے۔ اس پر تو دور جدید کے تمام مسلم مفکرین متفق ہیں کہ دین کا ترجمہ مذہب یا ریلیجن نہیں ہے۔ لیکن اس کا مناسب اردو یا انگریزی متبادل کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف اہل علم نے مختلف متبادل اصطلاحات تجویز کی ہیں۔ تاہم نظام زندگی، اسلوب حیات، عمومی رویہ یا انگریزی لفظ کلچر یا سسٹم بڑی حد تک اس جامعیت کے مفہوم کو ادا کر دیتے ہیں جو دین کے لفظ میں پوشیدہ ہے۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں دین کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس کے مفاہیم میں نظام جزاو سزا، قانون، تہذیب و تمدن، عبادات اور مذہبی عقائد وغیرہ شامل ہوتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ زندگی کے یہ سب پہلو دین میں شامل ہیں۔

قرآن پاک کی نظر میں دین (یعنی زندگی کا عمومی رویہ اور نظام حیات) دو ہی ہیں۔ ایک وہ جو اللہ کی مرضی اور منشا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے پر مبنی ہو اور دوسرا وہ جو اللہ کی مرضی اور منشا سے انحراف سے عبارت ہو۔ اللہ کی نظر میں زندگی کا پہلا رویہ ہی قابل قبول ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۳:۱۹) یعنی اللہ کے نزدیک دین وہی ہے جو اس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دینے سے عبارت ہو۔ اس طرز عمل کے علاوہ اگر کوئی طرز عمل انسان اختیار کرے گا تو اللہ کی بارگاہ میں قابل قبول نہ ہو گا (آل عمران ۳:۸۵)۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں ادیان کا لفظ صیغہ جمع میں کہیں نہیں آیا۔ شاید اس لیے کہ دین کی کوئی تیسری قسم واقعتاً موجود ہی نہیں ہے۔ اللہ کی مرضی سے انحراف کی بہت سی صورتیں اور محرکات و عوامل ہو سکتے ہیں لیکن انحراف ہونے کی حیثیت

سے وہ سب صورتیں ایک ہی زمرہ میں شمار ہوں گی۔

قرآن پاک سے پتا چلتا ہے کہ دین اسلام (یعنی اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کا رویہ) ابتدائے آفرینش سے خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی رہا ہے۔ تمام انبیا علیہم السلام نے اسی ایک دین کی دعوت دی جس کی بنیادیں توحید، رسالت اور آخرت کے اصول سہ گانہ پر ایمان، انبیا کی لائی ہوئی شریعت پر عمل درآمد اور مکارم اخلاق کا اختیار کرنا تھا۔ مختلف انبیا نے اپنے اپنے مخاطبین کی ذہنی اور ثقافتی سطح کے مطابق ان اصولوں کی تعلیم دی۔ جب انسانیت عہد طفولیت کے مرحلہ سے گزر رہی تھی تو اس وقت کے انبیا نے سادہ اور ابتدائی اصولوں تک اپنی تعلیم و تبلیغ کو محدود رکھا۔ جوں جوں انسانیت ارتقا کے مراحل طے کرتی گئی انبیا کی تعلیم میں بھی وسعت اور گہرائی آتی چلی گئی۔ یہی حال انبیا کی لائی ہوئی شریعتوں کا بھی رہا۔ جن اقوام میں ڈسپلن اور نظم و ضبط کی کمی تھی ان کو سخت احکام دیے گئے۔ جن قوموں میں قانون پسندی کا مطلب ظاہر پرستی اور حرفیت پسندی قرار پایا ان کو ایسے احکام دیے گئے جن کے ذریعے قانون کی اصل روح کو اجاگر کیا جا سکے۔

دین کے اصولوں پر عمل درآمد اور انسانی زندگی میں ان اصولوں کی عملی تشکیل کا واحد راستہ شریعت کہلاتا ہے۔ یہ اصطلاح قرآن پاک میں بھی مختلف صیغوں (شریعت، شرعۃ، شرع) میں استعمال ہوئی ہے اور احادیث مبارکہ میں بھی بار بار آئی ہے۔ اصطلاحی اعتبار سے اس سے مراد زندگی گزارنے کا وہ راستہ ہے جو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ لغوی اعتبار سے شریعت سے مراد وہ کشادہ، سیدھا، واضح اور صاف راستہ ہے جو کسی بستی کے لوگوں کو پانی کے ذخیرہ اور مصدر و ماخذ تک پہنچا دے۔ پرانے زمانہ میں دیہاتوں کے ماحول میں جب گھروں میں پانی کی فراہمی کا انفرادی بندوبست نہیں ہوتا تھا، عموماً بستی سے باہر کسی کنویں، تالاب، نہر یا چشمہ وغیرہ سے پانی لایا جاتا تھا اور انسانوں اور مویشیوں کے بار بار وہاں آنے جانے سے ایک ایسا راستہ بن جاتا تھا جو سیدھا، مختصر، کشادہ، واضح اور صاف ہوتا تھا۔ اسی راستہ کو عربی لغت میں شریعت کہا جاتا تھا۔

قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں اسلامی نظام زندگی کے لیے شریعت کی اصلاح کا استعمال بڑا اہم اور معنی خیز ہے۔ اس اصطلاح سے اسلامی قانون کے مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان کی یہ موجودہ زندگی محض ایک عارضی زندگی ہے جو ایک مختصر سے وقفہ میں ایک سفر کی حالت میں ہے اور مسلسل حقیقی زندگی کی طرف سفر کر رہی ہے۔ انسان حقیقی زندگی کے سفر پر جس راستہ سے گزر کر کامیاب ہو سکتا ہے وہ راستہ شریعت کے نام سے موسوم کیا گیا۔

قرآن مجید میں ایک جگہ (انبیا ۲۱: ۳۰) یہ بتایا گیا ہے کہ ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا

ہے۔ یعنی پانی زندگی کا ماخذ و مصدر ہے اور جو راستہ زندگی کے ماخذ و مصدر تک لے جائے وہ لغوی اعتبار سے شریعت کہلاتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک میں ایک جگہ (عنکبوت ۲۹: ۶۴) میں بتایا گیا ہے کہ آخرت کی زندگی ہی دراصل حقیقی اور دائمی زندگی ہے۔ لہٰذا جو راستہ حقیقی اور دائمی زندگی کے ماخذ و مصدر یعنی اخروی کامیابی تک لے جائے وہ بھی شریعت ہی کی اصطلاح سے موسوم کیا گیا۔ پھر ایک شریعت ہی کی اصطلاح نہیں، اسلام کی دوسری بہت سی اصطلاحات میں سفر اور راستہ کا مفہوم موجود ہے، جو مسلسل ایک مسلمان کو یہ یاد دہانی کراتا رہتا ہے کہ یہ زندگی ایک چند روزہ سفر سے عبارت ہے جس کی منزل مقصود کہیں اور ہے۔ چنانچہ صراط مستقیم جس کی دعا ہر مسلمان دن رات میں کم از کم سترہ مرتبہ ضرور کرتا ہے، اسی سیدھے راستے کا دوسرا نام ہے، جس کو شریعت کہا گیا ہے۔ پھر سبیل، طریقت، سلوک، مقامات، منازل، توبہ، رجوع، انابت وغیرہ بہت سی اصطلاحات میں یہی سفر اور راہ راست پر چلنے کا مفہوم ملتا ہے۔ علاوہ ازیں زاد راہ، دلیل، امام، نور وغیرہ بھی ضروریات سفر ہی میں سے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اس واضح راستہ یعنی شریعت کی امتیازی خصوصیات بیان فرمائی ہیں۔ ایک مشہور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ میں جو راستہ لے کر آیا ہوں وہ یکسوئی کے ساتھ منزل مقصود تک لے جانے والا (حنفیۃ)، نرمی اور آسانی پیدا کرنے والا (سمحۃ)، سہولت بخش (سھلۃ) روشن (بیضا) اور اتنا واضح کہ اس کی رات بھی اس کے دن کی طرح چمکدار ہے (لیلھا، کنھارھا)۔ یہ سب وہی خصوصیات ہیں جو شریعہ کے لغوی مفہوم میں بھی پائی جاتی ہیں۔

کامیابی کے اس راستہ پر سفر کی کئی سطحیں ہیں۔ ایک سطح عقائد، ذہنی تصورات اور عقلی نظریات کی سطح ہے۔ یہ شریعت کا وہ حصہ ہے جس سے علم کلام یا علم عقائد میں بحث ہوتی ہے۔ اس شعبہ علم کو آج کل بعض عرب مولفین علم توحید کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ شریعت کا یہ حصہ انسانی زندگی کے ان بنیادی سوالات سے بحث کرتا ہے جن پر انسان کی پوری زندگی کا دارومدار ہے۔ اس دنیا میں انسان کی حیثیت اور مقام و مرتبہ کیا ہے، وہ کہاں سے آیا ہے، کیوں آیا ہے، کیسے آیا ہے، اس کے آنے کا مقصد کیا ہے، اس کے آنے کے مقصد کا تعین کون اور کیسے کرے گا؟ انسان کی اس زندگی کی حقیقت کیا ہے، اس زندگی کے بعد اسے کہاں جانا ہے اور کس طرح جانا ہے، یہ اور اس طرح کے بہت سے دوسرے سوالات انسان کی کامیاب زندگی کے لیے بڑی بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ جب تک ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب انسان کے پاس موجود نہ ہو، وہ اپنی زندگی کا کوئی نظام مرتب نہیں کر سکتا۔ دنیا کے ہر قانون، فلسفہ، نظریہ اور تہذیب و ثقافت کی پشت پر ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور موجود ہوتا ہے جس سے اس کا نظریہ کائنات یعنی weltan schauung وجود میں

آتا ہے۔

ان بنیادی سوالات کا جواب دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اسلام نے ان معاملات کو انسانی عقل و فکر کے دائرہ سے باہر کر دیا ہے اور ان امور میں عقل کا دائرہ محدود کر دیا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام نے پیچیدہ بنیادی مسائل اور لاینحل عقدوں کو حل کر کے انسانی عقل کی سرگرمیوں کو ایک مثبت اور بامعنی سمت عطا کر دی ہے۔ اب انسانی عقل کے لیے اس بنیادی روشنی سے کام لے کر فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے بنیادی مسائل کا حل کر دینا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اب انسانی عقل ان بھول بھلیوں میں بار بار گم نہیں ہو گی جو ان سوالات کا جواب فراہم نہ ہونے کی وجہ سے بار بار راہ سے بھٹکی ہے۔ اب ہر نئے آنے والے فلسفی اور مفکر کو از سر نو ان سوالات پر غور کر کے نت نئے اور مضحکہ خیز جوابات دینے اور پہلے سے موجود فکری الجھنوں کو اور الجھانے کی ضرورت نہیں۔ اب قرآن پاک نے ان تمام بنیادی گتھیوں کو حل کر دیا ہے جن کے حل نہ ہونے کی وجہ سے ہزارہا سال سے انسانی عقل دربدر کی ٹھوکریں کھاتی رہی ہے۔ یہ بنیادی سوالات جن کے جوابات کو اسلامی فکر میں اصول موضوعہ کی حیثیت حاصل ہے، 'عقائد' کے نام سے موسوم ہیں۔ عقیدہ جس کے لفظی معنی گرہ کے ہیں انسانی ذہن و فکر کی وہ لگام ہے جو اس کو راہ راست پر قائم رکھتی ہے۔

عقائد کے بعد دوسری سطح انسان کے قلبی احساسات اور جذبات و عواطف کی سطح ہے۔ شریعت کی تعلیم کا وہ حصہ جو ان امور کو منضبط کرتا ہے 'تزکیہ یا احسان' کہلاتا ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی کے اس پہلو کو بڑی اہمیت دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی رو سے جب تک انسان کے قلبی احساسات درست اور مثبت رہتے ہیں، انسان کی پوری زندگی درست اور مثبت رہتی ہے۔ مگر جوں ہی قلبی احساسات بگڑتے اور منفی رخ اختیار کرتے ہیں، انسان کی پوری زندگی بگڑ کر منفی راستہ پر چل پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسان کے جذباتی استحکام اور قلب کی راست روی پر بڑا زور دیا ہے اور اپنی تعلیم کا ایک اہم حصہ اس کے لیے وقف کیا ہے۔ لیکن جذباتی استحکام اور قلبی راست روی آسان کام نہیں ہے۔ زندگی میں ہزاروں منفی قوتیں اور لاکھوں ترغیبات ایسی موجود ہیں جن سے دامن بچا کر کامیابی سے نکل جانا بڑی پختہ تربیت اور مستحکم ایمان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ پختہ تربیت اور مستحکم ایمان اللہ کی بارگاہ میں دائمی حضوری کے احساس و ایقان کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ حضوری کا یہی احساس و ایقان ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان سے تعبیر فرمایا ہے۔ حدیث جبریل میں جب آپؐ سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے جس روحانی تربیت اور مکارم اخلاق کی مشق کی

ضرورت ہوتی ہے اس کو قرآن مجید میں تزکیہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ روحانی پاکیزگی اور مکارم اخلاق کی تربیت جو پیغمبر کی چہار گانہ ذمہ داریوں میں سے ایک ہے، ایک طویل کوشش، مسلسل مشق اور جاں گسل روحانی سفر کی متقاضی ہے۔ اس روحانی سفر کو سلوک اور سیر کی اور اس مشق کو مجاہدہ کی اصطلاحات سے یاد کیا جاتا ہے۔ جن تعلیمات و ہدایات اور تدابیر کی اس سفر میں ضرورت پڑتی ہے ان کو طریقہ یا طریقت کا نام دیا گیا۔ یہی علم طریقت ہے جو بعد میں تصوف کہلایا۔ طریقت یا روحانی سفر کا یہ راستہ چوں کہ بڑا دشوار ہوتا چلا گیا اور مادی ترغیبات کے آئے دن نت نئے حملوں نے نئی نئی تدابیر کی ضرورت کا احساس دلایا اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ سفر کسی باکمال راہبر کی نگرانی میں طے کیا جائے جو تقویٰ، اتباع سنت، التزام شریعت اور روحانی پاکیزگی کی صفات سے متصف ہو۔ اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے باکمال راہبروں کی تلاش خود اپنی جگہ ایک اہم مسئلہ قرار پایا۔ اور ایک بار راہبر مل جائے تو اس کے قافلہ (سلسلہ) سے وابستہ رہنا گویا سفر کی سہولت اور منزل کی ضمانت ٹھہرا، اس طرح سلسلہ ہائے تصوف وجود میں آ گئے۔

تزکیہ و احسان کے بعد تیسری سطح انسان کی ظاہری اور عملی زندگی کی ہے۔ شریعت کا وہ حصہ جو انسان کے ظاہری اعمال و افعال کو منضبط کرتا ہے، فقہ کہلاتا ہے۔ انسان کے جسمانی افعال و اعمال اور اعضا و جوارح کی سرگرمیاں لامتناہی ہیں۔ وہ رات کو بستر پر آرام سے لے کر بین الاقوامی سطح تک کی لاکھوں قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے۔ ان سب اعمال کو کسی قاعدہ اور ضابطہ کے تحت منضبط کرنا شریعت کی تعلیم کا سب سے بڑا اور سب سے اہم حصہ ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ شریعت کی تعلیم کے مذکورہ بالا دونوں پہلو، ایک اعتبار سے اسی تیسرے پہلو کی تمہید کی حیثیت رکھتے ہیں اور انسان کو اس کے لیے تیار کرتے ہیں۔ چونکہ شریعت کی تعلیم کا یہ حصہ اپنے موضوع کی کثرت اور تنوع کے اعتبار سے سب سے بڑا ہے اس لیے بعض اوقات شریعت کی اصطلاح کا اطلاق اسی پر کر دیا جاتا ہے۔ اور ارباب تسمیہ الجزء باسم الکل شریعت کے اس حصہ کو ہی شریعت کہہ دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے فقہ اور شریعت کی اصطلاحات کبھی کبھی مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتی ہیں۔

فقہ کے لفظی معنی کسی چیز کی گہری فہم اور سمجھ بوجھ کے ہیں۔ بظاہر فقہ کے لفظی معنی اور انسان کے ظاہری اعمال کو منضبط کرنے والے مجموعہ ہدایات کے درمیان کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن تھوڑا سا غور کرنے سے یہ مناسبت واضح ہو جاتی ہے۔

انسان اپنی زندگی میں جتنے اعمال بھی کرتا ہے وہ لامتناہی ہیں۔ ایک دوکاندار کو دوکان داری اور تجارت کے دوران بے شمار قسم کے اعمال اور سرگرمیاں اختیار کرنا پڑتی ہیں۔ ایک شخص کھانا کھانے ہی کے دوران بیسیوں قسم کے عمل کرتا ہے۔ ملازمت کرنے والے کو ملازمت کے سلسلہ میں ہزاروں

اعمال و افعال سے واسطہ پڑتا ہے۔ان اعمال کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ ان کا شمار ہو سکتا ہے۔اربوں اور کھربوں سے بھی شاید ان کی تعداد متجاوز ہی ہوگی۔ان کے مقابلہ میں شریعت کی وہ ہدایات (نصوص) جو ان کھربوں اعمال کو منضبط کرتی ہیں' وہ بہت ہی محدود ہیں۔قرآن پاک کی چھ ہزار چند سو آیات میں سے بمشکل چند سو وہ ہیں جو براہ راست عملی ہدایات دیتی ہیں اور جن کو آیات احکام کہا جاتا ہے۔اسی طرح چالیس پچاس ہزار احادیث کے ذخیرہ میں وہ احادیث جو براہ راست عملی ہدایات پر مشتمل ہیں اور جن کو احادیث احکام کہا جاتا ہے' اڑھائی تین ہزار سے متجاوز نہیں ہیں۔گویا یہ تین ہزار چند سو نصوص اربوں انسانوں کے کھربوں اعمال کو منظم و منضبط کرتی ہیں۔

ان چند ہزار نصوص کی روشنی میں انسان اعمال کو منظم و مرتب اور منضبط کرنے کا یہ اہم ترین عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان نصوص پر گہرا غور و فکر نہ کیا جائے اور اچھی بصیرت اور عمیق فہم سے کام نہ لیا جائے۔اس لیے عمیق فہم اور گہری بصیرت اس پورے عمل کا لازمی حصہ ہے جس کے بغیر شریعت کی تعلیم کے اس حصے پر عمل در آمد نہیں ہو سکتا۔یہی وجہ ہے کہ نہ صرف قرآن پاک میں بلکہ احادیث نبویؐ اور پورے اسلامی ادبیات کے ذخیرے میں فقہ کا لفظ اسی بصیرت افروز' بصیرت آمیز اور مبنی بر بصیرت تعلیم کے لیے استعمال ہوا ہے۔جس کی گہرائی اور گیرائی کی مثال انسانی فکر و علوم کی تاریخ میں ناپید ہے۔فقہ کے ارتقا اور تشکیل میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں نے حصہ لیا ہے اور اس مجموعہ علوم کو بجا طور پر اسلامی علوم و ثقافت اور تہذیب و افکار کا گل سرسبد قرار دیا جاتا چلا ہے۔

فقہائے کرام نے فقہ کی بہت سی تعریفیں کی ہیں۔جن میں جو بات قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ یہ شریعت کے احکام کا وہ حصہ ہے جو انسان کے اعمال (بمقابلہ افکار و احساسات) سے بحث کرتا ہے۔عام طور پر فقہائے کرام کے ہاں جو تعریف مقبول و معروف ہے وہ ہے: العلم بالاحکام الشریعة العملیة عن ادلتها التفصیلیة یعنی فقہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ شریعت کے عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کیا جائے۔معاصر عراقی فقیہ استاذ عبدالکریم زیدان کی رائے میں فقہ کی یہ تعریف سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہے۔

انسان کی عملی زندگی اور اس کے ظاہری اقوال و افعال کو منظم و منضبط کرنے والے علم کی حیثیت سے فقہ کا دائرۂ کار قریب قریب پوری انسانی زندگی کو محیط ہے۔انسان کی پیدائش سے لے کر مرنے تک اس سے جو بھی اقوال و افعال سرزد ہوتے ہیں' فقہ ان سے بحث کرتی ہے۔بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ فقہ کے احکام کا اطلاق انسان کی ذات پر اس کی پیدائش سے پہلے سے شروع ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد تک جاری رہتا ہے۔اس پوری مدت میں انسان کا کوئی قول یا فعل ایسا نہیں جس کے بارے میں فقہ کا کوئی مثبت یا منفی موقف نہ ہو اور جس کے بارے میں فقہ کا کوئی حکم موجود نہ ہو۔

ایک شخص وفات پا جاتا ہے اور اس کی بیوہ کے ہاں چند ماہ بعد بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔ اب اس مرنے والے کی جائیداد اس وقت تک تقسیم نہیں ہو سکے گی جب تک اس میں اس نئے آنے والے بچے کا حصہ نہ رکھ دیا جائے۔ بعض فقہا کی رائے تو یہ ہے کہ ابھی سرے سے وراثت ہی تقسیم نہیں کی جائے گی اور بچے کی پیدائش کا انتظار کیا جائے گا۔ اگر وہ لڑکا ہو تو لڑکے کا حصہ اس کو دیا جائے گا اور لڑکی ہو تو لڑکی کا۔ گویا ابھی بچے کی پیدائش نہیں ہوئی لیکن اس کی متوقع پیدائش کے عمل پر احکام فقہ کا اطلاق ابھی سے شروع ہو گیا' بالفاظ دیگر بچہ نے اپنی پیدائش سے قبل ہی شریعت کا حکم امتناعی حاصل کر لیا اور وراثت کی تقسیم روک دی۔

اسی طرح ایک شخص وفات پانے سے قبل اپنی کچھ جائیداد وقف کر دیتا ہے یا اپنی جائیداد کے ایک حصے کے بارے میں وصیت کر جاتا ہے کہ وہ فلاں مد میں خرچ کر دیا جائے۔ اب جب تک وہ جائیداد یا وہ حصہ دنیا میں موجود ہے وہ مرنے والے کے وقف کی شرائط یا وصیت کی تفصیلات کے مطابق ہی استعمال کیا جائے گا' چاہے اس پر سیکڑوں سال گزر جائیں۔ اس لیے کہ شریعت کا اصول ہے: شرط الواقف کنص الشارع وقف کرنے والے کی طے کردہ شرائط اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح شریعت کی نصوص۔ مثلاً وقف کرنے والے نے طے کیا یا وصیت کرنے والے نے وصیت کی کہ اس کی موقوفہ یا وصیت شدہ جائیداد کی آمدنی فلاح علاقہ کے لوگوں کو دی جایا کرے یا فلاں فلاں کو دے دی جائے۔ یا اس کو مثلاً کمپیوٹر سائنس کے طلبہ کی تعلیم اور ان کو وظائف کی فراہمی پر خرچ کر دیا جائے تو اس رقم کو اسی علاقہ کے لوگوں کو دیا جائے گا اور اس سے کمپیوٹر سائنس کے طلبہ ہی کو وظائف دیے جائیں گے۔ اسلامیات حتیٰ کہ قرآن و حدیث کے طلبہ تک کو اس رقم سے وظیفہ دینا جائز نہ ہو گا۔

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا سے انسان کے چلے جانے کے بعد بھی اس کے اقوال و اعمال و افعال پر فقہی احکام کا اطلاق ہوتا رہتا ہے اور جب تک انسان کے اقوال و اعمال کے اثرات و ثمرات باقی ہیں وہ فقہ کے احکام سے منظم و منضبط ہوتے رہیں گے (جاری)۔

صدقے کے طریقے

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ہر نفس کو ہر ہر دن جس میں طلوع ہوتا ہے، اپنی طرف سے صدقہ کرنا لازم ہے،

میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ، میں کہاں سے صدقہ کروں؟ ہمارے پاس تو اموال نہیں ہیں!

آپ ﷺ نے فرمایا:

صدقہ کے ابواب میں سے:

- ☆ تکبیر، سبحان اللہ، الحمد للہ، لاالٰہ الااللہ، استغفر اللہ کے کلمات ہیں،
- ☆ اور یہ بات کہ تو معروف کا حکم دے، منکر سے روکے،
- ☆ اور یہ کہ لوگوں کے راستے سے کانٹے، ہڈی اور پتھر دور کردے،
- ☆ نابینا کو راستہ بتلادے،
- ☆ بہرے گونگے کو اس طرح سے بات بتادے کہ وہ سمجھ جائے،
- ☆ حاجت مند کو اس جگہ کا پتہ بتادے جہاں سے اس کی حاجت پوری ہو،
- ☆ پریشان حال فریاد کرنے والے کی طرف اپنی مضبوط پنڈلیوں کے ساتھ دوڑ کر پہنچ جائے،
- ☆ کمزور کی مدد کے لیے اپنے مضبوط بازوؤں کے ساتھ اٹھ کھڑا ہو،

صدقے کے ان تمام طریقوں میں سے ہر طریقہ تیری طرف سے اپنے نفس کے لیے صدقہ ہے!

مسند احمد (۵-۱۶۸) (بحوالہ محمد ناصر الدین البانی الاحادیث الصحیحہ، ج ۲- حدیث نمبر ۵۷۵)

اسلام کی پکار ' اِتحادِ اُمت

مفتی محمد شفیعؒ

امت اسلامیہ ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے 'مگر ہمارے حالات و واقعات ' دنیا کو اس کے خلاف یہ دکھلا رہے ہیں کہ یہ امت ایک " ناقابل اجتماع تشتت" ہے۔ اپنے حالات اور خصوصیات وقت سے صرف نظر کر کے ' مسئلہ کے دلائل پر بحث ایک نرا فلسفہ ہے 'جس سے ہماری کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے اس مسئلہ کے مثبت پہلو پر کچھ کلام کرنے سے زیادہ اس کے منفی پہلو افتراق و تشتت ' اور اس کے اسباب پر غور اور اس کے علاج کی فکر کرنا ہے۔

جہاں تک اسلام کی دعوت اتحاد ' اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو ' بلکہ کل انسانوں کو ' ایک قوم ' ایک خاندان ' ایک برادری ' قرار دینے کا معاملہ ہے ' وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی مسلمان پر مخفی ہو۔ قرآن کریم کے واضح الفاظ ' خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ میں تمام ابنائے آدم اور بنی نوع انسان کو ' اور اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ میں مسلمانوں کو ایک برادری قرار دیا گیا۔ مگر اب یہ ایک عقیدہ اور نظریہ ہے جو زبانوں پر جاری اور کتابوں میں لکھا ہوا ہے ' لیکن جب اپنے گردوپیش ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے انسانوں کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے برعکس یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ملت ایک تفرقہ ہے ' جس میں اجتماع کا امکان دور دور نہیں۔ وہ ملت جس نے دنیا کے تمام انسانوں کو ایک خدا کی اطاعت پر جمع کر کے ایک برادری بنانے کی دعوت دی تھی: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء ۴: ۱) لوگو ' اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ آج وہ ملت طرح طرح کے تفرقوں میں مبتلا ' ایک دوسرے سے بیزار اور برسرپیکار نظر آتی ہے۔ اس میں سیاسی پارٹیوں کے جھگڑے ' برادریوں کی تفریق ' پیشوں اور کاروبار کی تقسیم ' امیر غریب کے تفرقہ کی بنیاد منافرت تھی ہی ' زیادہ افسوس اس کا ہے کہ خداپرستی اور دین بھی آج ہمارے لیے جنگ و جدل اور عداوتوں اور جھگڑوں کا ذریعہ بن گیا۔ اس نے پوری ملت کو دینی و دنیوی ہر اعتبار سے ہلاکت کے غار میں دھکیل دیا اور اس سے بچنے کا کوئی علاج نظر نہیں آرہا۔ ہماری ہر تنظیم تفریق اور ہر اجتماع '

افتراق کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

یہی وہ روگ ہے جس نے ملت اسلامیہ کو اس عظیم الشان عددی اکثریت کے باوجود پسماندہ بنایا ہوا ہے۔

ہر قوم ہمیں اپنے میں جذب کرنے کی طمع رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر عقائد سے لے کر اعمال و اخلاق تک ' ثقافت و معاشرت سے لے کر معاملات و اقتصادیات تک ' ہر قوم کی یلغار ہے۔ ایک طرف حکومت و اقتدار اور اقتصادیات و تجارت میں ان پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے ' تو دوسری طرف ملحدانہ تلبیسات کے ذریعہ ان کے عقائد و نظریات کو متزلزل اور ان کی خدا پرستی کے اصول کو نئی تعلیم و تہذیب اور خیر خواہی اور ہمدردی کے عنوان سے ہوا پرستی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ ہمارے عوام انگریز کے ڈیڑھ سو سالہ اقتدار میں مختلف تدبیروں کے ذریعہ علم دین سے محروم اور حقائق سے ناآشنا کر دیے گئے ' اب گھر کی دولت علم و فکر گنوا کر جو کچھ دوسروں کی طرف سے آتا ہے ' اسی کو سرمایہ سعادت سمجھنے لگے ' خصوصاً جبکہ اس تعلیم و تہذیب کے سایہ میں نفس کی بے لگام خواہشات اور عیش و عشرت کا میدان بھی کھلا نظر آتا ہے۔ ہمارے علما اور اہل فکر و نظر ' اپنے جزوی اور فروعی اختلافات اور بہت سے غیر ضروری مسائل میں ایسے الجھ گئے کہ ان کو اسلام کی سرحدوں پر ہونے والی یلغار کی گویا خبر ہی نہیں۔

مرض کے اسباب

سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نظری مسائل میں آرا کا اختلاف نہ مضر ہے ' نہ اس کے مٹانے کی ضرورت ہے اور نہ مٹایا جا سکتا ہے۔ اختلاف رائے نہ وحدت اسلامی کے منافی ہے ' نہ کسی کے لیے مضر۔ اختلاف رائے ایک فطری اور طبعی امر ہے ' جس سے نہ کبھی انسانوں کا کوئی گروہ خالی رہا ' نہ رہ سکتا ہے۔ کسی جماعت میں ہر کام اور ہر بات میں مکمل اتفاق رائے صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک ' یہ کہ ان میں کوئی سوجھ بوجھ والا انسان نہ ہو جو معاملہ پر غور کر کے کوئی رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس لیے ایسے مجمع میں ایک شخص کوئی بات کہہ دے تو دوسرے سب اس پر اس لیے اتفاق کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی رائے اور بصیرت ہی نہیں۔ دوسرے ' اس صورت میں مکمل اتفاق رائے ہو سکتا ہے کہ مجمع کے لوگ ضمیر فروش اور خائن ہوں کہ ایک بات کو غلط اور مضر جانتے ہوئے محض دوسروں کی رعایت سے اختلاف کا اظہار نہ کریں۔

جہاں عقل بھی ہو اور دیانت بھی ' یہ ممکن نہیں کہ ان میں اختلاف رائے نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف رائے عقل و دیانت سے پیدا ہوتا ہے ' اس لیے اس کو اپنی ذات کے اعتبار سے مذموم نہیں کہا جا سکتا۔ اگر حالات و معاملات کا صحیح جائزہ لیا جائے ' اختلاف رائے اگر اپنی حدود کے اندر رہے تو

کبھی کسی قوم و جماعت کے لیے مضر نہیں ہوتا، بلکہ بہت سے مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ اسلام میں مشورہ کی تکریم اور تاکید فرمانے کا یہی منشا ہے کہ معاملہ کے متعلق مختلف پہلو اور مختلف آرا سامنے آجائیں تو فیصلہ بصیرت کے ساتھ کیا جاسکے۔ اگر اختلاف رائے مذموم سمجھا جائے تو مشورہ کا فائدہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

صحابہؓ و تابعینؒ میں اختلاف رائے کا درجہ

انتظامی اور تجرباتی امور میں تو اختلاف رائے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آپؐ کی مجلس میں بھی ہوتا رہا۔ خلفائے راشدینؓ اور عام صحابہ کرامؓ کے عہد میں 'امور انتظامیہ کے علاوہ' جب نئے نئے حوادث اور شرعی مسائل پیش آئے' جن کا قرآن و حدیث میں صراحتاً ذکر نہ تھا' یا قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت سے' یا ایک حدیث کا دوسری حدیث سے بظاہر تعارض نظر آیا اور ان کو قرآن و سنت کی نصوص میں غور کر کے تعارض کو رفع کرنے اور شرعی مسائل کے استخراج میں اپنی رائے اور قیاس سے کام لینا پڑا' تو ان میں اختلاف رائے ہوا' جس کا ہونا عقل و دیانت کی بنا پر ناگزیر تھا۔

اذان اور نماز جیسی عبادتیں' جو دن میں پانچ مرتبہ میناروں [سے بلند] اور مسجدوں میں ادا کی جاتی ہیں' ان کی بھی جزوی کیفیات میں اس مقدس گروہ کے افراد کا خاصا اختلاف نظر آتا ہے' اور اس اختلاف رائے پر باہمی بحث و مباحثہ میں بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

ایسے ہی غیر منصوص یا مبہم معاملات حلال و حرام جائز و ناجائز میں بھی' صحابہ کرامؓ کی آرا کا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ پھر صحابہ کرامؓ کے شاگرد حضرات تابعین کا یہ عمل بھی ہر اہل علم کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی جماعت کسی صحابی کی رائے کو اختیار کر لیتی تھی' اور کوئی ان کے بالمقابل دوسری جماعت دوسرے صحابی کی رائے پر عمل کرتی تھی' لیکن صحابہ و تابعین کے اس پورے خیر القرون میں اور اس کے بعد' آئمہ مجتہدین اور ان کے پیروؤں میں کہیں ایک واقعہ بھی اس کا سننے میں نہیں آیا' کہ ایک دوسرے کو گمراہ یا فاسق کہتے ہوں' یا کوئی مخالف فرقہ اور گروہ سمجھ کر ایک دوسرے کے پیچھے اقتدا کرنے سے روکتے ہوں' یا کوئی مسجد میں آنے والا لوگوں سے یہ پوچھ رہا ہو کہ یہاں کے امام اور مقتدیوں کا اذان و اقامت کے صیغوں میں' قرات فاتحہ اور رفع یدین وغیرہ میں کیا مسلک ہے؟ ان اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل' یا سب و شتم' توہین' استہزا اور فقرہ بازی کا تو ان زمانوں میں کوئی تصور ہی نہ تھا۔

امام ابن عبدالبر قرطبی نے اپنی کتاب "جامع بیان العلم" میں سلف کے باہمی اختلافات کا حال یوں بیان کیا ہے۔ یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہل فتویٰ فتوے دیتے رہے۔ ایک شخص غیر منصوص احکام میں ایک چیز کو حلال قرار دیتا اور دوسرا اسے حرام کہتا' مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا کہ

جس نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے وہ ہلاک اور گمراہ ہوگیا' اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا کہ حرام کا فتویٰ دینے والا ہلاک یا گمراہ ہوگیا۔ اسی کتاب میں نقل کیا ہے کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے فقیہ مدینہ حضرت قاسم بن محمدؒ سے ایک مختلف فیہ مسئلہ کے متعلق دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ان دونوں آرا میں سے آپ جس پر عمل کرلیں' کافی ہے' کیونکہ دونوں طرف صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کا اسوہ موجود ہے"۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں اصول دین اور اسباب اختلاف سے ناواقف لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شریعت اسلام میں ایک چیز حلال بھی ہو اور حرام بھی ہو' اور جائز بھی ہو' ناجائز بھی ہو۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے ایک غلط اور ایک صحیح ہوگی۔ پھر دونوں جانب کا یکساں احترام کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ کلام' مطلق حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں نہیں۔ کیونکہ قرآن و سنت کے منصوصات اور تصریحات کے اعتبار سے کچھ چیزیں واضح طور پر حرام ہیں' جیسے سود' شراب' جوا' رشوت وغیرہ' ان میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں اور نہ سلف صالحین کا ان میں کہیں اختلاف ہو سکتا تھا' اور ان میں اختلاف کرنا تو دین کے بینات اور واضح نصوص کا انکار کرنا ہے جو بہ اتفاق امت گمراہی اور الحاد ہے' اور جو ایسا کرے اس سے بیزاری اور برات کا اعلان کرنا عین تقاضائے ایمان ہے۔ اس میں رواداری ممنوع ہے۔

یہ رواداری کی تلقین اور اختلاف رائے کے باوجود اپنے مخالف رائے کا احترام' صرف ایسے مسائل میں ہے جو یا تو قرآن و سنت میں صراحتاً مذکور نہیں' یا مذکور ہیں مگر ایسے اجمال و ابہام کے ساتھ کہ ان کی تشریح و تفسیر کے بغیر ان پر عمل نہیں ہو سکتا' یا دو آیتوں یا دو روایتوں میں بظاہر کچھ تعارض نظر آتا ہے۔ ان سب صورتوں میں مجتہد عالم کو قرآن و سنت کے نصوص میں مقدور بھر غور و فکر کرکے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کا منشا اور مفہوم کیا ہے اور اس سے کیا احکام نکلتے ہیں؟ اس صورت میں ممکن ہے کہ ایک عالم مجتہد' اصول اجتہاد کے مطابق قرآن و سنت اور تعامل صحابہ وغیرہ میں غور کرکے' اس نتیجہ پر پہنچے کہ فلاں کام جائز ہے' اور دوسرا عالم مجتہد' انھی اصولوں میں پورا غور و فکر کرکے' اس کے ناجائز ہونے کو صحیح سمجھے۔ ایسی صورت میں یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر و ثواب کے مستحق ہیں' کسی پر کوئی عتاب نہیں۔ جس کی رائے اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح ہے' اس کو دوہرا اجر و ثواب اور جس کی صحیح نہیں' اس کو ایک اجر ملے گا۔ اسی سے بعض اہل علم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اجتہادی اختلافات میں دونوں متضاد قول' حق و صحیح ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام احکام

عبادات و معاملات سے بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مقصود کوئی خاص کام نہیں' بلکہ بندوں کی اطاعت شعاری کا امتحان ہے۔ جب دونوں نے اپنی اپنی غور و فکر اور قوت اجتہاد' شرائط کے ساتھ خرچ کر لی تو دونوں اپنا فرض ادا کر چکے' دونوں صحیح جواب ہیں۔

ایک اہم واقعہ

یہاں ایک اہم واقعہ بھی آپ کے گوش گزار کروں' جو اہم بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔

قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا' اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے' میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا: حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا: ہاں ٹھیک ہی ہے میاں' مزاج کیا پوچھتے ہو' عمر ضائع کر دی!

میں نے عرض کیا: حضرت' آپ کی ساری عمر' علم کی خدمت میں' دین کی اشاعت میں گزری ہے' ہزاروں آپ کے شاگرد علما ہیں' مشاہیر ہیں' جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں' آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی۔

فرمایا: میں تمھیں صحیح کہتا ہوں' عمر ضائع کر دی!

میں نے عرض کیا: حضرت بات کیا ہے؟

فرمایا: ہماری عمر کا' ہماری تقریروں کا' ہماری ساری کدو کاش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں' امام ابو حنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے آئمہ کے مسلکوں پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا' تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔ اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابو حنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج نہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے' وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا' وہ ہمارے محتاج نہیں۔

فرمایا: اور' امام شافعیؒ' مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہا جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطاء" (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں' اور دوسرے کے مسلک کو "خطاء محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں' ان تمام بحثوں' تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔

پھر فرمایا: ارے میاں ' اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا۔ اجتہادی مسائل کا فیصلہ بھی دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ہم ' تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح ' یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو ' اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے۔ قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا ' آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی۔ برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔

حضرت شاہ صاحب کے الفاظ یہ تھے: اللہ تعالیٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا نہ ابو حنیفہؒ کو ' نہ مالکؒ کو نہ احمد بن حنبلؒ کو۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے ' جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے ' جنھوں نے نور ہدایت چار سو پھیلایا ہے ' جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں ' اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدان محشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابو حنیفہ نے صحیح کہا تھا یا شافعی نے غلط کہا تھا ' یا اس کے برعکس --- یہ نہیں ہو گا۔ [چونکہ جب رب کریم نے دنیا میں مجتہد کو غلطی کے باوجود ' ایک ثواب سے نوازا ہے ' اور ان کی غلطی پر پردہ ڈالا ہے ' تو اس کی رحمت سے بعید ہے کہ حشر میں ان میں سے کسی کی غلطی کا اعلان کر کے اسے رسوا کرے]۔

فرمایا: جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے ' نہ برزخ میں ' نہ محشر میں ' اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی ' اپنی قوت صرف کر دی۔ اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی جس پر سب کا اجماع تھا ' اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے ' اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں ' جن کی دعوت انبیاکرام علیہم السلام لے کر آئے تھے ' جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا ' اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی ' آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی ' یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں۔ اپنے اور اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں ' اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیے تھا ' وہ پھیل رہے ہیں ' گمراہی پھیل رہی ہے ' الحاد آ رہا ہے ' شرک و بت پرستی چل رہی ہے ' حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ' ان فرعی و فروعی بحثوں میں۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی"۔

آرا میں تضاد کا مسئلہ

ایسے اختلاف کے متعلق ' جس میں صحابہ کرامؓ کی دو رائیں ہوں ' امام ابو حنیفہ نے فرمایا: متضاد

اقوال میں سے ایک خطا ہے، مگر اس خطا کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے۔ (جامع بیان العلم، ج ۲، ص ۸۳)

امام مالکؒ سے صحابہ کرامؓ کے باہمی اختلافات کے متعلق سوال کیا گیا، تو فرمایا: ان میں بعض خطا ہیں بعض صواب و صحیح، تو عمل کرنے والے لئے اجتہاد کو غور کر کے کوئی جانب متعین کرنا چاہیے۔ (ایضاً)

امام مالکؒ نے یہاں یہ واضح کر دیا کہ: اختلاف اجتہاد میں ایک جانب صحیح اور دوسری جانب خطا ہوتی ہے، دونوں متضاد چیزیں صواب نہیں ہوتیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: اس اختلاف والوں میں باہم جھگڑا اور جدال جائز نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ جس کو خطا پر سمجھتا ہے، اس کو نرمی اور خیر خواہی سے خطا پر متنبہ کر دے۔ پھر وہ قبول کرے تو بہتر، ورنہ سکوت کرے، جدال اور جھگڑا یا بدگوئی نہ کرے۔ امام مالک فرماتے تھے: علم میں جھگڑا اور جدال، نور علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے۔ کسی نے عرض کیا: ایک شخص جس کو سنت کا علم حاصل ہے، کیا وہ حفاظت سنت کے لیے جدال کر سکتا ہے؟ فرمایا: نہیں، اس کو چاہیے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کر دے، پھر وہ قبول کرے تو بہتر ہے، ورنہ سکوت اختیار کرے۔ نزاع و جدال سے پرہیز کرے۔ (اوجز المسالک، شرح موطا مالک، ج ۱، ص ۱۵)

محمد بن عبدالرحمٰن صیرفیؒ نے امام احمد بن حنبلؒ سے سوال کیا کہ جب کسی مسئلہ میں صحابہ کرامؓ باہم مختلف ہوں تو کیا ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ہم ان میں غور و فکر کر کے یہ فیصلہ کریں کہ ان میں صحیح کس کا قول ہے؟ فرمایا: رسول اللہؐ کے صحابہؓ کے اختلاف میں لوگوں کو نقد و نظر نہ کرنا چاہیے۔ صیرفیؒ نے کہا کہ پھر عمل کس کے قول پر اور کس طرح کریں؟ امام احمد نے فرمایا: ان میں سے جس کا جی چاہے اتباع کر لو۔ (جامع بیان العلم، ج ۲، ص ۸۳)

گویا امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا مسلک تو یہ ہوا کہ جب صحابہ کرامؓ کا باہم کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو بعد کے فقہا کو چاہیے کہ دلائل میں غور کر کے، جس کا قول سنت سے زیادہ قریب سمجھیں اس کو اختیار کر لیں۔ امام احمد کے نزدیک اس کی بھی ضرورت نہیں، دونوں طرف صحابہؓ ہیں تو جس کا قول چاہیں، اختیار کر سکتے ہیں۔

امام شافعیؒ کے ایک مفصل کلام کو نقل کر کے ابن عبدالبر نے فرمایا: امام شافعی کے اس کلام میں اس کی دلیل موجود ہے کہ مجتہدین میں کوئی دوسرے کو یہ نہ کہے کہ آپ غلطی اور خطا پر ہیں۔ (جامع بیان العلم، ج ۲، ص ۳۰۷)۔ وجہ یہ ہے کہ ایسے اجتہادی مسائل میں کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے قول کو یقینی طور پر صواب و صحیح اور دوسرے کے قول کو یقینی طور پر خطا و غلط کہہ سکے۔ اجتہاد اور

پورے غور و فکر کے بعد جو رائے اس نے قائم کی ہے' اس کے متعلق اس سے زیادہ کہنے کا کسی کو حق نہیں کہ رائے صحیح و صواب ہے' مگر احتمال خطا اور غلطی کا بھی ہے' اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے کا قول صحیح و صواب ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجتہادی اختلافات میں جمہور علما کے نزدیک علم الٰہی کے اعتبار سے دو مختلف آرا میں سے حق تو کوئی ایک ہی ہوتی ہے' مگر اس کا متعین کرنا کہ ان میں سے حق کیا ہے؟ اس کا یقینی ذریعہ کسی کے پاس نہیں۔ دونوں طرف خطا و صواب کا احتمال موجود ہے۔ مجتہد اپنے غور و فکر سے کسی ایک جانب کو راجح قرار دے کر عمل کے لیے اختیار کر لیتا ہے۔

جن مسائل میں صحابہؓ و تابعین" اور آئمہ مجتہدین" کا نظری اختلاف ہوتا ہے' ان کا قطعی فیصلہ نہ یہاں ہو گا' نہ آخرت میں۔ اس لیے عمل کرنے والوں کے لیے ان میں سے ہر ایک کی رائے پر اپنی ترجیح کے مطابق عمل کر لینا جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ ان مسائل میں کوئی عالم کتنی ہی تحقیقات کرے' یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی تحقیق کو یقینی حق و صواب کہا جائے اور اس کے مقابل کو باطل قرار دیا جائے۔ حافظ شمس الدین" ذہبی نے فرمایا ہے کہ جس مسئلہ میں صحابہؓ و تابعین" کا اختلاف ہو گیا وہ اختلاف قیامت تک مٹایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اس اختلاف کے مٹانے کی ایک ہی صورت ہے کہ ان میں سے کسی ایک گروہ کو قطعی طور پر حق پر اور دوسرے کو یقینی باطل قرار دیا جائے' اور یہ ممکن نہیں ہے۔

ان تصریحات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس مسئلہ میں صحابہؓ و تابعین" اور آئمہ مجتہدین کا اختلاف ہو' اس کی کوئی جانب شرعی حیثیت سے منکر نہیں کہلائے گی' کیونکہ دونوں آرا کی بنیاد قرآن و سنت اور ان کے مسلمہ اصول پر ہے' اس لیے دونوں جانب داخل معروف ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین" کا بے شمار مسائل میں جواز و عدم جواز اور حرمت و حلت کا اختلاف ہونے کے باوجود کہیں منقول نہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پر اس طرح نکیر کرتا ہو جیسے منکرات پر کی جاتی ہے' ایک دوسرے کو یا اس کے متبعین کو گمراہی یا فسق و فجور کی طرف منسوب کرتا ہو' یا اس کو ارتکاب حرام کا مجرم قرار دیتا ہو۔

مطالعہ کتاب

خطوط مودودیؒ - ایک تاثراتی مطالعہ

دوسری قسط

پروفیسر خورشید احمد

آرزوئے دل

سید مودودی کے دل کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ جی جان سے غلبہ دین کے لیے جدوجہد کریں۔ ان کی دیرینہ تمنا تھی کہ: ''کوئی چوٹ خدا کی راہ میں کھاؤں اور اسی چوٹ کا داغ لے کر مالک کے دربار میں حاضر ہو جاؤں''۔ ان کی ہر تحریر' ہر خط' اسی جذبے اور لگن کا آئینہ دار ہے' اور اس مقصد کے لیے ان کی استقامت اور مضبوط کردار کا عکاس۔ آیئے چند جھلکیاں دیکھیں:

علامہ اقبال کے ایما پر بادشاہی مسجد لاہور کی امامت کی پیش کش [۱۹۳۷] کے جواب میں مولانا مودودی' سید نذیر نیازی صاحب کو لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی زندگی کے لیے چند اصول ایک خاص نصب العین کے ساتھ مقرر کر لیے ہیں اور خدا کے فضل سے میرے اندر اتنی استقامت موجود ہے کہ میں سخت سے سخت مشکلات میں بھی اپنے نصب العین سے ہٹنا اور اپنے اصولوں میں ترمیم کرنا گوارا نہیں کرتا۔ اس وقت میں جن مشکلات میں مبتلا ہوں وہ تمام تر میری اپنی عائد کی ہوئی پابندیوں کی وجہ سے ہیں' ورنہ یہ طوفان مصائب آج دور ہو سکتا ہے۔ میں نے اپنے اوپر جو پابندیاں عائد کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں کسی سے اپنی ذات کے لیے کوئی مالی مدد نہ لوں گا۔ دوسری یہ ہے کہ قومی اور مذہبی خدمت کے سلسلے میں کوئی معاوضہ لینے کا خیال بھی نہ کروں گا۔ اور تیسری یہ ہے کہ ایسی منفعت کے لالچ میں اپنے آپ کو گرفتار نہ ہونے دوں گا جو' مجھ کو دین وملت کے مفاد کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق آزادانہ کام کرنے سے روکتی ہو (چند پابندیاں اور بھی ہیں 'مگر وہ زیر بحث معاملات سے غیر متعلق ہیں)۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جو صورتیں آپ نے بیان فرمائی ہیں' انھیں قبول کرنا میرے لیے کس قدر مشکل ہے۔ میں اپنی ذات کے لیے سو روپے کیا معنی' ایک پیسے کی بھی مدد نہیں چاہتا۔ اپنے ذاتی مصارف کے لیے میں نے ایک تجارتی کام شروع کر رکھا ہے' اسی کو میں لاہور میں بھی کر سکتا ہوں۔ شاہی مسجد کی امامت

میرے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس سے بہتر موقع کام کرنے کا اور کیا ہو سکتا ہے، مگر معاوضہ لے کر امامت کرنا میرے نزدیک ناجائز نہیں تو سخت مکروہ ضرور ہے۔ مسلمانوں میں چار سو برس سے یہ مسئلہ متفق علیہ رہا ہے کہ نماز کی امامت اور قرآن کی تعلیم کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔ بعد میں حالات کی خرابی نے اس کو جائز کرا دیا، اور اسی وقت سے یہ دونوں منصب ذلیل اور بے روح ہو گئے ہیں۔ میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، اس لیے معاوضہ لے کر امامت کرنے کا تو خیال بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں، اگر بلا معاوضہ یہ خدمت میرے سپرد کی جائے تو دل و جان سے اس کے لیے حاضر ہوں"۔

"رہی سیاست سے کنارہ کشی تو اس کے لیے میں قطعاً تیار نہیں ہوں۔ میں نے کسی فوری جذبے کے تحت سیاسیات کی طرف قدم نہیں بڑھایا ہے، بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب مجھے گوشہ عزلت سے نکل کر کچھ کرنا چاہیے۔ مسلمان اس وقت سخت خطرے میں مبتلا ہیں۔ جن سے صحیح رہنمائی کی امید نہ تھی انھیں چھوڑیے، جن سے تمام تر امیدیں وابستہ تھیں آج وہ بھی غلط رہنمائی کر رہے ہیں۔ کانگریسی تحریک کے فروغ نے مسلمانوں کے کیمپ میں عام بھگدڑ برپا کر دی ہے۔ روزانہ desertion کی خبریں دھڑا دھڑ چلی آرہی ہیں۔ جواہر لال کی امت عوام میں تیزی کے ساتھ اپنا اثر پھیلا رہی ہے۔ جھانسی کے انتخابات نے ظاہر کر دیا کہ مسلمانوں کی رائے عام کس حد تک متاثر ہو چکی ہے، اور اب کانگریسی اور غیر کانگریسی کے درمیان کتنا تھوڑا margin رہ گیا ہے۔ مسلمان لیڈروں کے بیانات اور اسلامی جرائد کے مضامین پڑھنے سے اندازہ ہو رہا ہے کہ کس قدر کم آدمی ہیں جو اسلامی ہند کی صحیح پوزیشن کو سمجھتے ہیں اور جن کے سامنے راہ راست بالکل واضح ہے۔ ایسی حالت میں آپ غور کیجیے کہ جو چند گنے چنے آدمی باقی رہ گئے ہیں، ان میں سے بھی ایک شخص کا اپنے اوپر پابندی عائد کر لینا، اور وہ بھی ڈیڑھ دو سو کی آمدنی کے لیے، کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اگر میں اس کو جائز سمجھ لوں تو مجھے لاہور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ جامعہ عثمانیہ میں چار سو روپے کی جگہ مجھے اس وقت مل رہی ہے، اس کو کیوں نہ قبول کر لوں۔ میں جس غرض کے لیے لاہور کا رخ کرنا چاہتا ہوں، وہ صرف یہ ہے کہ میرے نزدیک اسلامی ہند کا فیصلہ (جواب قریب ہی آگیا ہے) شمال کے تینوں صوبوں کی طاقت پر منحصر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس "دارالاسلام" کے قلب میں جا کر بیٹھوں اور دیکھوں کہ وہاں اسلام کی قوت کو بڑھانے اور اس سے کام لینے کے کون سے مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہاں سے میں کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ وہاں پہنچ کر مواقع تلاش کروں گا اور جو موقع بھی مجھ کو ملے گا، اس سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں اس قسم کے استفادے کے لیے اپنے دل و دماغ اور دست و پا کو بالکل آزاد رکھنا چاہتا ہوں، اور کسی قیمت پر بھی ایسی کوئی پابندی قبول نہیں کر سکتا، جو دین و ملت کی خدمت کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں مانع ہو"۔ (خطوط مودودی: ۲، ص ۱۸۱-۱۸۳)

مولانا مودودی کی ذاتی زندگی کا ایک بڑا دل کش پہلو یہ ہے کہ، ان کی نجی زندگی اور تحریکی زندگی اس طرح شیروشکر ہیں جیسے گلاب کی پکھڑی میں دو مختلف رنگ، بعض اوقات اس طرح باہم پیوست ہوتے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۰ سے جبل پور سے ایڈیٹر تاج کی حیثیت سے پہلے خط میں صوبہ متوسط کے دینی اور سیاسی حالات پر اضطراب کا اظہار کرتے ہیں اور مسئلہ خلافت اور مقامات مقدسہ کی تبلیغ وہدایت کے فروغ کے لیے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو دعوت دیتے ہیں کہ کچھ مبلغ وہاں بھیجیں۔ ۱۹۳۲ سے ترجمان القرآن کے ذریعے اپنی دعوت کا آغاز کرتے ہیں۔ جیسے جیسے برعظیم کے حالات بگڑتے ہیں اور مسلمانوں کو بڑے گھمبیر، فکری، سیاسی اور تہذیبی چیلنجوں سے سابقہ پیش آتا ہے، ویسے ہی ویسے مولانا کا اضطراب بڑھتا ہے۔ پھر وہ ایک عظیم معرکے کے لیے بے چین ہوکر میدان میں کود پڑتے ہیں۔ اس زمانے میں ان کا داعیانہ کردار ابھر کر سامنے آتا ہے اور پھر آخر دم تک یہی ان کی شخصیت کا رنگ غالب رہتا ہے۔ ان کی تحریر ہو یا تقریر، گفتگو ہو یا خط کتابت، ایک ایک لمحہ وہ اس کشمکش کی زندگی کی نذر کر دیتے ہیں اور اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتے ہیں۔

چودھری نیاز علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرے لیے اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ آپ کے ادارہ کی بنیاد پڑتی ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ مگر مجھ پر کام کا اتنا ہجوم ہے کہ اپنے ذاتی معاملات کی طرف بھی کافی توجہ نہیں کر سکتا۔ کوئی ایک شخص بھی میرا رفیق کار نہیں۔ چھوٹے اور بڑے سب کام مجھ کو تنہا خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔ ایک شدید خانگی ضرورت سے بیس روز کے لیے دہلی گیا تھا تو یہاں سارے کام درہم برہم ہوگئے اور اتنا کام میرے سر پر آپڑا کہ اب تک اس سے فارغ نہیں ہو سکا ہوں۔ اب میرے سامنے ایک بڑی مہم درپیش ہے، جس میں مجھے ہمہ تن منہمک ہو جانا پڑے گا۔ میں نے اس مہم کی ابتدا محرم کے ترجمان القرآن سے کر دی ہے اور آیندہ چند مہینوں میں دیکھنا ہے کہ کتنے مددگار ملتے ہیں۔ بہرحال میں یہ تصفیہ کر چکا ہوں کہ خواہ سارے ہندوستان میں ایک بھی ساتھی نہ ملے، میں تنہا اپنی ذات سے اس جنگ کو شروع کروں گا اور آخر وقت تک جاری رکھوں گا۔ قطع نظر اس سے کہ کامیابی ہو یا نہ ہو، مسلمانوں کی اس وقت جو نازک حالت ہے اور جو خطرناک مستقبل ان کے سامنے ہے، اس کو دیکھ کر میں سمجھتا ہوں کہ آیندہ دس بیس سال ہندوستان میں اسلام کی قسمت کے لیے فیصلہ کن ہیں۔ اگر اس وقت ہم مدافعت کے لیے کھڑے نہ ہوئے، تو چند سال بعد ہم کو سکون کا کوئی گوشہ نہ ملے گا، جہاں بیٹھ کر ہم کوئی تعمیری کام کر سکیں"۔ (ایضاً، ص ۸۴-۸۸)

اس خط کے آخری الفاظ داعی کی اندرونی کیفیات کی کیسی زبردست ترجمانی کرتے ہیں:

"آپ نے جن جن امور کے متعلق لکھا ہے وہ سب میرے پیش نظر ہیں، اور ان شاء اللہ ان

سب کی طرف، جیسے جیسے فرصت ملے گی، توجہ کرتا رہوں گا، مگر آج کل میرے خیالات میں ایک ہلچل برپا ہے، جس نے مجھے پرسکون تفکر کے قابل نہیں رکھا۔ دہلی سے ایک آگ اپنے سینے میں لایا ہوں اور ہر لحہ یہ فکر دامن گیر ہے کہ اب کیا کروں۔ (ایضاً، ص ۸۹)

۷ ۱۹۳ا ہی کے ایک اور خط میں چودھری نیاز علی خاں صاحب کو لکھتے ہیں:

"میں خود اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اصل میدان مقابلہ شمالی ہندوستان ہے۔ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ وہیں ہو گا، اور اسی فیصلہ کے اثرات سارے ہندوستان میں پھیلیں گے۔ لہٰذا اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہاں سے ہجرت کروں اور شمالی ہند میں کسی جگہ قیام کروں۔ لیکن دارالہجرت کے انتخاب میں ابھی متردد ہوں۔ محرم کے اشارات شائع ہونے کے بعد سے بکثرت خطوط آ رہے ہیں، جن میں مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ راہ عمل تجویز کرو۔ میں بے صبری کے ساتھ کام کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ پورے غور و خوض کے ساتھ ایک نقشہ جنگ بنا رہا ہوں۔ ان شاء اللہ دو تین مہینے میں یہ نقشہ مکمل ہو جائے گا۔ اس کو شائع کرنے کے بعد من انصاری الی اللہ کی آواز بلند کروں گا اور صرف ایسے لوگوں کو دعوت دوں گا، جو وقت آنے پر یہ نہ کہہ دیں کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ"۔ (ایضاً، ص ۹۶-۹۹)

دور جدید کے حالات اور ان کے فتنوں کے گہرے مطالعے کے بعد مولانا مودودی اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کا مقابلہ جامد مذہبیت سے ممکن نہیں، اس کے لیے تو اسلام کو ایک عالم گیر انقلابی تحریک کی حیثیت سے ابھرنا اور زندگی کے نقشے کو بدلنا ہو گا۔ مغربی اور اشتراکی سامراج کی تباہ کاریوں کا کوئی مقابلہ اگر ممکن ہے تو وہ اسلام کے اس انقلابی تصور ہی سے ہو سکتا ہے۔ ۱۹۴۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کوشش کر رہا ہوں کہ مہاجرین ترکستان سے ان کی پوری داستان قلم بند کراؤں اور اسے سلیس اردو میں لکھوا کر شائع کر دوں۔ روس کی بلا اب دوسرے مسلمان ملکوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ طرابلس، مصواع اور درہ دانیال پر اس کا دانت ہے۔ سویز اور طنجہ کے انتظام میں وہ دخیل ہو چکا ہے۔ فلسطین و شام میں کمیونسٹ ایجنٹ کام کر رہے ہیں، اور ایران پر اس کی گرفت مضبوط ہو رہی ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی امپیریلزم نے جو کسر چھوڑ دی ہے، اب یہ تازہ بلا اسے پورا کیا چاہتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مسلمان ملکوں کی قوم پرستانہ تحریکیں اس عالم گیر انقلابی تحریک کے مقابلے میں ٹھیر سکیں گی۔ اگر مسلمان ملکوں میں دعوت اسلامی کا علم بلند کرنے والی کوئی طاقت نہ اٹھی، تو یہ فتنہ دجال کسی کے روکے نہ رک سکے گا"۔ (ایضاً، ص ۴۰)

اسی طرح اپنے بچوں کی تربیت اور ان کے بارے میں اپنے عزائم کا اظہار کرتے ہیں، تو انھیں

اسی جدوجہد کے لیے تیار کرنے کی فکر غالب ہے:

"اگر موسم اجازت دے تو اپنے ساتھ دونوں بڑے بچوں کو بھی لے آئیں..... پہلے میں نے اس لیے بچوں کو لانے سے منع کر رکھا تھا کہ بچوں کے ذہن پر یہاں کے ماحول کا برا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا، مگر اب غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انھیں یہ جگہ ضرور دکھا دینی چاہیے۔ کیا عجب کہ کل جو نسل اٹھنے والی ہے، وہ موجودہ نسل سے بھی زیادہ بگڑی ہوئی ہو اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو ہم سے بھی زیادہ سخت جدوجہد کرنی پڑے۔ میں اپنی اولاد کو عیش کے لیے نہیں پالنا چاہتا، بلکہ خیر کی خدمت اور شر سے جنگ کے لیے پالنا چاہتا ہوں"۔ (ایضاً، ص ۲۲۷)

دوستوں اور احباب کے اندر بھی وہ یہی چنگاری سلگانے کے لیے مضطرب ہیں۔ نذیر قریشی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرے لیے یہ خبر نہایت مسرت کی موجب ہے کہ آپ اپنی زندگی کا آخری حصہ میرے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں، مگر اس میں دیر کیوں ہے؟ کیا آپ کو اپنی تاریخ وفات معلوم ہو چکی ہے، جس کے لحاظ سے آپ نے تعین کر لیا ہے کہ آخری حصہ عمر فی الواقع کون سا ہے؟" (ایضاً، ص ۲۴-۲۵)

چودھری نیاز علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کے اندر بڑھاپے کا احساس پیدا ہو جانا موجب تشویش ہے۔ اصل بڑھاپا عمر کا نہیں بلکہ بوڑھے ہونے کے احساس کا ہے۔ اس احساس کو آپ نہ پیدا ہونے دیں اور جس مستعدی کے ساتھ آج تک کام کرتے رہے ہیں، اسی مستعدی کے ساتھ کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے عزم اور قوت کو برقرار رکھے"۔ (ایضاً، ص ۱۶۵)

داعی کی کیفیات اور انقلابی عزائم کا بہترین اظہار اس خط میں ہوتا ہے جو استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے چھوٹے بھائی استاذ رشید الدین فراہیؒ کو دارالاسلام سے دسمبر ۱۹۴۴ میں لکھتے ہیں۔ یہ ایک بڑا نازک مسئلہ تھا۔ مولانا رشید الدین چاہتے تھے کہ مولانا امین احسن اصلاحی کا تعلق دارالاصلاح سے حسب سابق برقرار رہے، خواہ اس کی شکل یہ ہو کہ نصف وقت مدرسہ کے لیے ہو اور نصف جماعت اسلامی کے لیے۔ ایسے بزرگ سے معذرت کرنا بڑا مشکل کام تھا اور مولانا مودودی اپنے جواب کا اس میں اظہار بھی کرتے ہیں کہ "آپ جیسے مخلص و مشفق بزرگ کی بات رد کرتے ہوئے مجھے دلی تکلیف ہوتی ہے"۔ لیکن دعوت کے تقاضوں اور نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے جن مردان کار اور جس کردار کی ضرورت ہے اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں، جس سے داعی کے فکر، عزم اور حوصلے کا نقش دل پر بیٹھ جاتا ہے اور بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے کہ

ع یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

اسی خط کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

"مولانا امین احسن صاحب کا تعلق مدرسہ اصلاح سے فی الواقع ویسا ہی استوار تھا جیسا جناب نے تحریر فرمایا ہے، اور فی الحقیقت اب سے دو تین سال پہلے تک وہ خود بھی اس بات کا تصور نہ کر سکتے تھے کہ کبھی ان کا اور مدرسے کا یہ تعلق ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ لیکن اپنے مدت العمر کے مطالعہ کتاب و سنت سے ہم لوگوں پر دین کی جو حقیقت کھلی ہے اور اس کے مطالبات و مقتضیات کا جو علم حاصل ہوا ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمیں اپنے عزیز ترین اور محکم ترین تعلقات کو بھی دل پر پتھر رکھ کر صرف اس وجہ سے توڑنا پڑا ہے کہ، دین کی خدمت کا جو راستہ ہمارے سامنے واضح ہو چکا ہے، اس پر چلنے کے لیے آزاد ہو جائیں۔ ہم اب اس چیز سے بالکل مطمئن نہیں ہیں کہ خدا سے پھری ہوئی اس دنیا میں بس کچھ لوگ خدا اور اس کے دین کا نام لینے والے موجود رہیں اور کفر سے مغلوبیت کی حالت میں جتنی گنجائش دین کے لیے رہ جائے، اس کو کچھ اپنے مذہبی اعمال و اقوال سے پر کرتے رہیں۔ ہمارے نزدیک یہ صورت حال نہ تو دین حق کو گوارا ہے اور نہ اس میں سچی دین داری زیادہ مدت تک زندہ رہ سکتی ہے، مگر ہمارے یہ مذہبی مدرسے جو آج کل مکتب میں قائم ہیں، زیادہ سے زیادہ بس یہی خدمت انجام دے سکتے ہیں اور اس سے آگے کے لیے ان میں کچھ گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے جہاں ہم موجودہ صورت حال سے غیر مطمئن ہیں، ان مدارس سے بھی ہمارا اطمینان اٹھ گیا ہے اور ان میں کام کرنے کو ہم اپنے وقت اور اپنی قوتوں کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک مقصد واضح طور پر آ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کا دین غالب ہو اور کفر و کفار اس سے دب کر رہیں۔ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ ۔ اس مقصد کے لیے ہم نے خوب سوچ سمجھ کر جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس پر عمل کرنے میں ہم اپنی تمام قوت صرف کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا کسی دوسرے کام میں، خواہ وہ بجائے خود کتنا ہی نیک کام ہو، اپنا ایک لمحہ صرف کرنا بھی ہمیں کھلتا ہے کیونکہ جس وقت کو اس مقصد عظیم کی خدمت میں صرف ہونا چاہیے اسے فروتر کاموں میں صرف کرنا حکمت کے خلاف ہے"۔

(ایضاً، ص ۳۰۰-۳۰۱)

مدرسے سے تحریک تک جو سفر داعی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے، اس کی بڑی حسین عکاسی جگر مراد آبادی کے آخری دور کے ان اشعار میں ہوتی ہے:

سلامت تو، ترا میخانہ، تیری انجمن ساقی
مجھے کرنا ہے اب کچھ خدمت دار و رسن ساقی
کبھی میں بھی تھا شاہد در بغل توبہ شکن میکش
مگر بننا ہے اب خنجر بکف ساغر شکن ساقی

اس مجموعہ مکاتیب کے صفحے صفحے پر داعی کی شخصیت کا یہ رخ دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ خود اس انقلابی کردار کا نمونہ ہے اور اس سانچے میں سب کو ڈھال دینا چاہتا ہے۔ مولانا نذیر الحق میرٹھی دعوت پر لبیک کہنے والے اولیں افراد میں سے تھے۔ جب وہ اس راہ میں قدم اٹھاتے ہیں تو انھیں پے بہ پے آزمائشیں گھیر لیتی ہیں۔ ہمت بندھاتے ہوئے ان کو ۱۹۴۹ میں لکھتے ہیں:

"یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ان پریشان کن حالات میں بھی آپ اپنے فرض سے غافل نہیں ہیں اور احمد آباد میں قرآنی نصب العین کی طرف دعوت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ یہی ایک مسلمان کی شان ہونی چاہیے۔ آغاز اسلام کے دور میں ہر شخص جو مسلمان ہوتا تھا، اس کے دل میں سب سے بڑھ کر جس چیز کی تڑپ ہوتی تھی، وہ یہ تھی کہ اپنے ابنائے نوع کو اس نعمت میں شریک کرے جو اسے حاصل ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان پر حقیقت میں حق منکشف ہو جاتا تھا اور انکشاف حق کا یہ فطری خاصہ ہے کہ وہ آدمی کے دل میں ایک آگ سی لگا دیتا ہے، جو اسے ہر وقت تبلیغ حق کے لیے بے چین رکھتی ہے۔ بعد کے ادوار میں یہ تڑپ کم ہوتی گئی، حتیٰ کہ مفقود ہو کر رہ گئی، کیوں کہ لوگ پیدائشی مسلمان ہونے لگے۔ اب ان پر حق منکشف نہیں ہوتا، بلکہ میراث میں ملتا ہے اور کون ہے جو میراث میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے بے چین ہوتا ہو؟ پس اگر ہم محض پیدائشی اور موروثی مسلمان نہیں ہیں، بلکہ ہم پر حق منکشف ہوا ہے اور ہم از سر نو ایمان لائے ہیں تو ہمارے اندر نو مسلمانہ جوش ہونا چاہیے۔ ہمیں اس طرح کام کرنا چاہیے، جس طرح طاعون یا ہیضہ کی وبا کے زمانے میں ایک سچا خادم خلق اپنے آرام اور اپنے کھانے پینے کو بھول جاتا ہے، اور اپنی بستی کے مریضوں کو دوا پلاتا اور ان کی دیکھ بھال کرتا پھرتا ہے، تاکہ انھیں ہلاکت سے بچائے"۔ (ایضاً، ص ۲۲۸-۲۲۹)

راہ حق میں عزیمت سید مودودی کے کردار کا ایک بڑا نمایاں پہلو ہے۔ خطوط میں بھی اس کا اظہار جگہ جگہ ہوتا ہے۔ ایک جگہ خود اپنی گرفتاری اور اہل خانہ اور تحریکی ساتھیوں کی ان کوششوں کے بارے میں جو وہ مولانا محترم کی رہائی کے لیے کرنا چاہتے ہیں، اپنے عزم کا اظہار اپنے بڑے بھائی جناب سید ابوالخیر مودودی کے نام ایک خط میں نئی سنٹرل جیل، ملتان سے اس طرح کرتے ہیں:

"آپ لوگ جب کبھی میری رہائی کے لیے کسی کوشش کا خیال ظاہر کرتے ہیں، میں آپ کو اس سے منع نہیں کرتا، صرف اس وجہ سے کہ آپ لوگوں کی اور خصوصاً والدہ صاحبہ کی دل شکنی مجھے گوارا نہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ ایک فضول اور غیر ضروری کام ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ لوگ ذرا صبر سے کام لیں۔ دیکھتے رہیں کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میرا عمر بھر کا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا میں کبھی وہ طاقتیں زندہ نہیں رہ سکی ہیں، جنھوں نے قلعوں میں پناہ لینے کی کوشش

کی ہے، کیونکہ میدان کے مقابلے سے جی چرانا اور قلعوں کے پیچھے چھپنا بزدلی کی کھلی علامت ہے، اور خدا نے اپنی یہ زمین بزدلوں کی فرماں روائی کے لیے نہیں بنائی ہے۔ اسی طرح میرا مطالعہ مجھے یہ بھی بتاتا ہے کہ جن لوگوں کا کاروبار جھوٹ اور فریب اور مکر کے بل پر چلتا ہے، اور جن کے لیے حقیقت و صداقت کی روشنی میں آجانا "خطرے" کا حکم رکھتا ہے، اور جن کو اپنی حکمرانی کی حفاظت کے لیے سیفٹی قسم کے قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے، ایسے اخلاقی بزدلوں کی چوبی ہنڈیا زیادہ دیر تک چولھے پر نہ کبھی چڑھی رہ سکی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔ یہ چیز عقل کے خلاف ہے، قانون فطرت کے خلاف ہے اور ہزار ہا برس کے تاریخی تجربات اس پر شاہد ہیں کہ ان سہاروں پر جینے والے تھوڑی دیر کے لیے چاہے کتنا ہی زور باندھ لیں، بہرحال وہ دیر تک نہیں جی سکتے۔ میں اپنی خاطر نہیں، خود ان لوگوں کی خاطر ہی یہ چاہتا تھا کہ یہ ہوش کے ناخن لیں اور سیدھے سیدھے بھلے آدمیوں کی طرح کام کریں۔ اس لیے میں نے باہر بھی انھیں سمجھانے کی کوشش کی اور اب اندر سے بھی اتمام حجت کر دیا۔ اب اگر یہ دنیا کی ہزاروں مرتبہ آزمائی ہوئی حماقتوں کا تجربہ کرنے ہی پر مصر ہیں تو انھیں تجربہ کر لینے دو"۔ (ایضاً، ص ۳۴۲-۳۴۳)

اس مجموعے میں مولانا مودودی کا وہ خط بھی شامل ہے، جو انھوں نے اتحاد المسلمین، حیدر آباد، دکن کے قائدین کے نام ۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ کو لکھا تھا۔ یہ خط مولانا مرحوم کی سیاسی بصیرت اور برعظیم کے حالات پر ان کی گرفت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے تجزیئے کا یہ حصہ کتنا سچا اور سبق آموز ہے:

"ہندوستان کے مسلمانوں نے ابھی ابھی اپنا جو انجام دیکھا ہے اور دیکھ رہے ہیں، وہ دراصل خمیازہ ہے، ان کوتاہیوں کا جو پچھلی صدیوں میں ہمارے حکمران، ہمارے امرا، ہمارے مذہبی پیشواؤں کا ایک بڑا گروہ اور باستثنا چند، ہمارے عام اہل ملت اپنے اس فرض کی ادائی میں برتتے رہے ہیں، جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا تھا۔ اگر وہ اسلام کی صحیح نمایندگی کرتے، اگر وہ اپنے اخلاق اور معاملات اور اپنی سیرتوں میں اسلام کا صحیح نمونہ پیش کرتے، اور اگر اپنی سیاست اور حکمرانی میں عدل و انصاف پر قائم رہتے، اور اپنی طاقتوں کو اسلام کی سچائی پھیلانے میں صرف کرتے تو آج دہلی اور مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب سے مسلمان اس طرح بیک بنی و دوگوش نہ نکال دیے جاتے جیسے اس وقت نکالے گئے ہیں، اور یوپی، بہار اور وسط ہند میں ان کے سر پر اس طرح تباہی منڈلا رہی نہ ہوتی جیسی آج منڈلا رہی ہے۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں سات آٹھ سو سال تک مسلمانوں کا اقتدار رہا ہے، جہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی عظیم الشان جاگیریں، حیدر آباد کی پائے گاہوں سے کئی گنی زیادہ بڑی جاگیریں قائم رہی ہیں اور جہاں مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے علوم و فنون کے عظیم الشان مرکز موجود رہے ہیں۔ لیکن عیش، دنیا میں انہماک، فوجی طاقت اور سیاسی اقتدار پر انحصار، اسلام کی دعوت

پھیلانے سے تغافل اور انفرادی سیرتوں اور اجتماعی طرزِ عمل میں اسلام کے اخلاقی اصولوں سے انحراف کا یہ نتیجہ ہوا، کہ ان علاقوں کی عام آبادی غیر مسلم رہی، مسلمان ان کے درمیان آٹے میں نمک کے برابر رہے اور دلوں کو مسخر کرنے کی بجائے معاشی اور سیاسی دباؤ سے گردنیں اپنے سامنے جھکوانے پر اکتفا کرتے رہے۔ پھر جب سیاسی اقتدار ان سے چھنا اور ایک غیر ملکی قوم ان پر مسلط ہوئی، تب بھی انھوں نے اور ان کے رہنماؤں نے ان اسباب کو سمجھنے کی کوشش نہ کی، جن کی بنا پر وہ حاکم سے محکوم بن کر رہ گئے تھے، بلکہ انھوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے بل پر جینے کی کوشش کی اور اپنے سیاسی مطالبے اور دعوے کو ہمسایہ اکثریت کے مقابلے میں اس تیسری طاقت سے، جس کے اقتدار کو بہرحال عارضی ہی ہونا تھا، منواتے رہے۔ اس تمام مدت میں زندگی کی جو مہلت مسلمانوں کو ملی تھی، اس میں اپنی اخلاقی اصلاح کرنے اور اپنے بزرگوں کی غلطیوں کی تلافی کرنے کے بجائے مسلمان محض معاشی اور سیاسی فائدوں کے لیے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ کشمکش کر کے بظاہر یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے جینے کا سامان کر رہے ہیں، لیکن دراصل اپنی قبر کھود رہے تھے۔ آخر کار آج ہماری بدقسمت آنکھوں نے دیکھ لیا کہ بہت سے تو اس قبر میں دفن ہوگئے اور بہت سے زندہ درگور ہیں"۔ (ایضاً، ص ۳۰۸-۳۰۹)

مولانا نے جو مشورے حیدر آباد کی مسلم قیادت کو دیے تھے، ان کو اس قیادت نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور چند ماہ بعد سلطنت آصفیہ کی پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آرہی، اور اقبال نے جو کچھ سسلی کے بارے میں کہا تھا اس کی مصداق ہوگئی ع وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار۔

مولانا مودودی کے مکاتیب میں تعلیم اور اس کے مسائل کا ذکر بار بار آتا ہے۔ بات حال کے تجزیے کی ہو یا مستقبل کی منصوبہ بندی کی—— تعلیمی بگاڑ اور اس کی اصلاح مولانا مودودی کا خاص موضوع ہے۔ البتہ وہ تعلیم کو بھی حق و باطل کی اس کشمکش کے پس منظر میں دیکھتے ہیں جو آج عالمِ اسلام میں برپا ہے۔ کراچی یونی ورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے میگزین "الجامعہ" کو جو پیغام خط کی شکل میں ۲۵ جنوری ۱۹۷۲ کو بھیجا گیا، اس میں فرماتے ہیں:

"طالب علم ہونے کی حیثیت میں آپ لوگوں کا اولین فریضہ تحصیلِ علم ہے، لیکن ہمارا وطن عزیز جس اندوہناک سلسلہ حادثات سے دوچار ہے، اس سے پاکستان کا کوئی بھی نوجوان، بوڑھا، پڑھا لکھا، اَن پڑھ بے تعلق یا غیر متاثر نہیں رہ سکتا۔ اس وقت ہمارے جسدِ ملت کا آدھا حصہ کاٹ کر الگ کر دیا گیا ہے اور بقیہ کی جان کے لالے پڑ چکے ہیں۔

اس لیے پوری قوم کے ساتھ اس کے تعلیم یافتہ اور جوان طبقے کو بھی پورے غور و فکر کے ساتھ اور آنکھیں کھول کر یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر ہمیں یہ دن دیکھنے پڑے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری رسوائی و ناکامی کی بنیادی وجہ منافقت اور ہمارے قول و فعل کا تضاد ہے۔ ہم کفار

کے تسلط اور بھائی چارے سے یہ کہہ کر الگ ہوئے تھے کہ ہمارا راستہ ہر لحاظ سے ان سے جدا ہے۔ لیکن آزادی و استقلال کے بعد ہم نے وہ نظام تعلیم' وہ نظام حکومت' وہ نظام معیشت و معاشرت اختیار کیے رکھا اور اسی پر اب تک مُصر ہیں جو کفار کے لیے بھی باعث عار ہو' مگر نام ہم اب تک اسلام' اسلامی مساوات' اسلامی ثقافت اور اسلامی اقدار کا لیے چلے جا رہے ہیں۔ جب تک اس دو رنگی کا خاتمہ نہ ہو گا' ہمارے مصائب و آلام کا بھی خاتمہ نہ ہو گا۔ کفر کے مقابلے میں اسلام غالب آ سکتا ہے' مگر کفر کے بالمقابل نفاق سرخرو نہیں ہو سکتا"۔ (ایضاً' ص ۵۰۱-۵۰۲)

تزکیہ اور تعلیم اور حکمت و دعوت کے نقطہ نظر سے بھی ان خطوں میں بڑا خزانہ موجود ہے۔ صحیح اسلامی تربیت کا تصور اپنے ایک خط میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"سب سے بڑی چیز جس کی اس وقت کی نظر آ رہی ہے' وہ صحیح اسلامی تربیت ہے۔ جدید مدارس تو خیر انگریزی اغراض کے لیے قائم ہوئے ہیں' مگر ہمارے قدیم عربی مدرسے اور قومی ادارے بھی اس باب میں ناقص ہیں۔ خانقاہ میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے' جہاں "شیخ" اور "مرید" (یہ لفظ میں مجبوراً استعمال کر رہا ہوں' اصطلاحی مفہوم مراد نہیں ہے) دونوں اپنی اصلاح کریں اور ایک دوسرے کی تربیت کریں' اور باہر کا جتنا زنگ ہر ایک پر کم یا زیادہ چڑھ گیا ہے' اس کو سب مل کر ایک دوسرے پر سے کھرچیں اور آپس کی معاونت سے ایک دوسرے میں خالص اسلامی سیرت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ وہاں احتساب نفس پہلے ہو' پھر النصح للہ کے اصول پر عمل کیا جائے' اور مداہنت سے سخت پرہیز کیا جائے۔ صحابہ کرامؓ اور اکابر اسلام کی زندگیاں پیش نظر رکھی جائیں اور خصوصیت کے ساتھ ان طریقوں کی پیروی کی جائے' جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی تربیت فرمائی تھی"۔ (ایضاً' ص ۵۷)

اسی طرح تعلیمی اور تحقیقی اداروں میں نماز اور روزے کی پابندی کی اہمیت بیان کرتے ہیں' لیکن روح عبادت پر خصوصی توجہ دیتے ہیں:

"نماز اور روزے کی سخت پابندی ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ انتہائی کوشش کی جائے کہ اوامر کے اتباع اور نواہی سے اجتناب کیا جائے اور یہ پابندی شریعت مجبورانہ نہ ہو بلکہ بطوع و رغبت خود اپنے نفس کے میلان سے ہو۔ ادارے کی اصلی خوبی یہی ہونی چاہیے کہ وہاں کی آب و ہوا میں اسلامیت کا اتنا غلبہ ہو جائے کہ نیکیاں خود بخود نشوونما پانے لگیں اور شرور و عصیاں کے بیج خود بخود جل کر رہ جائیں"۔ (ایضاً' ص ۵۸)

تحریک کے نہایت قیمتی رفیق اور اپنے عزیز ساتھی ڈاکٹر نذیر احمد شہید کو ان کی اعتکاف میں مانگی جانے والی دعا کے سلسلے میں بڑے پیار سے متوجہ کرتے ہیں:

"اعتکاف میں آپ نے جو دعا مانگی ہے' اس کے آخری حصے سے آپ اجتناب ہی کرتے تو بہتر تھا۔ ہمارا کام بد دعا کرنا نہیں ہے۔ ہمیں ہر وقت اللہ سے اپنے حق میں بھی دعاے خیر کرنی چاہیے اور دوسروں کے حق میں بھی۔ ہمیں بیمار سے نہیں' اس کی بیماری سے نفرت ہے۔ انسانی ہمدردی اور اسلامی اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بد تر سے بد تر بیمار پر بھی رحم کھائیں اور خدا سے یہی چاہیں کہ وہ اس کی بیماری کو رفع کر دے۔ باقی رہا خدا کا اور اس کا معاملہ' تو وہ ان شاء اللہ پورے انصاف کے ساتھ ہو گا اور جس نے بھی نیت کی خرابی کے ساتھ دین حق کے کام میں خرابی ڈالی ہوگی اور مرنے سے پہلے توبہ و اصلاح نہ کی ہوگی' وہ خدا کی پکڑ سے نہ بچ سکے گا"۔ (ایضاً' ص ۴۲۸)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو لکھنؤ میں اپنے قیام کے انتظامات کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں۔ بات صرف قیام کی جگہ کی ہے' لیکن دیکھیے کس طرح داعی کی شخصیت اور اس کے عزائم اور ترجیحات کی غمازی کرتی ہے:

"عنایت نامہ ابھی ملا اور آج ہی اتفاق کی بات ہے کہ نواب صاحب چھتاری کا خط آیا جس میں انھوں نے ایک کمیٹی کی شرکت کے لیے مجھے لکھنؤ آنے کی دعوت دی ہے۔ ان نوابوں اور ان کی کمیٹیوں سے تو مجھے کوئی دلچسپی نہیں اور اگر محض ان کی کمیٹی میں شرکت کا معاملہ ہوتا تو میں ٹال دیتا' مگر اس بہانے "ندوہ" سے اور آپ کے رفقاے کار سے براہ راست تعلق قائم کرنے کا ایک موقع ہاتھ آتا ہے۔ اس لیے میں نے لکھنؤ حاضر ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میں ان شاء اللہ ۳ جنوری کو لکھنؤ پہنچوں گا۔ میرے قیام کے لیے کوئی مناسب انتظام کرنا آپ کے ذمے ہے۔ میں کسی ایسی جگہ ٹھیرنا چاہتا ہوں جہاں ہر قسم کے لوگ مجھ سے مل سکیں اور آزادی کے ساتھ گفتگو کر سکیں۔ علی گڑھ میں' میں نے اولڈ بوائز لاج کو پسند کیا تھا' اس کا یہ فائدہ ہوا کہ ہر خیال اور ہر گروہ کے آدمی مجھ سے بے تکلف ملے۔ ایسی ہی کوئی جگہ میں لکھنؤ میں چاہتا ہوں۔ میں چونکہ بے ہمہ ہوں اس لیے خدا نے مجھے باہمہ بھی بنا دیا ہے۔ سخت قسم کے دہریے اور کمیونسٹ بھی مجھ سے اسی طرح ملتے ہیں جس طرح مومنین' صادقین' اور ان لوگوں سے بات چیت کرنے میں ایسی جگہ آسانی رہتی ہے' جہاں وہ شخصیتیں نہ ہوں جن سے یہ لوگ باتکلف گفتگو کرنے پر مجبور ہوتے ہیں"۔ (ایضاً' ص ۲۶۱-۲۶۲)

جیسا کہ ہم نے عرض کیا مولانا مودودی کے خطوط کا اصل محور اسلامی فکر اور تحریک اسلامی کی دعوت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان خطوں کی حیثیت ایک قوس قزح کی سی ہے' جس میں بہت سے نشاط آگیں رنگ جمع ہیں۔ جس طرح کسی نے علامہ محمد اقبال کے بارے میں کہا تھا کہ ان کا کلام خیالات اور تصورات کا ایک شیش محل (museum of ideas) ہے' بالکل اسی طرح مولانا مودودی کے خطوط فکر و فن کے ہزار رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان خطوں کا اصل موضوع تو فلسفہ' کلام'

سیاست ' دعوت اور تزکیہ ہی ہیں ' لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ ادبی نکات اور ان کی تشریح و توضیح سے خالی ہوں۔ جناب فروغ احمد صاحب کی ایک نظم پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فروغ صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اپنی عمدہ شاعرانہ صلاحیت کو انسانیت کے بھٹکانے میں نہیں ' بلکہ اس کو راہ راست کی طرف لانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ کوئی شعر و ادب محض اپنی لفظی و معنوی خوبیوں کی بنا پر قابل قدر نہیں ہے۔ وہ اگر زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے کام نہیں کرتا تو ذہن کی عیاشی اور ارباب نشاط کی سی عشوہ گری ہے اور اگر زندگی کو بگاڑنے کے لیے کام کرتا ہے تو میٹھا زہر ہے۔ قدر کے قابل وہ صرف اس وقت ہوتا ہے جب اس کا حسن زندگی کے جمال میں اضافے کا موجب ہو رہا ہو" (ایضاً ' ص ۵۰۰)

اردو سے انگریزی میں ترجمہ کے اصول پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی اور اپنے لائق دوست ڈاکٹر سید عبداللطیف کی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"تاخیر کا سبب یہ ہوا کہ آپ کا ترجمہ دیکھنے کے بعد میں نے مختصراً اپنی رائے لکھ کر اپنے دوست ڈاکٹر سید عبداللطیف کے پاس اسے بھیج دیا تھا۔ یہ صاحب عثمانیہ یونی ورسٹی میں انگریزی ادب کے سینئر پروفیسر ہیں اور بہترین انگریزی لکھنے والوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے پاس سے جواب آنے میں بہت دیر ہوگئی۔ انھوں نے پورے ترجمہ کو پڑھ کر میری رائے سے اتفاق کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مفہوم آپ نے پورا ادا کر دیا ہے ' مگر اصل کی پابندی میں زبان کی ادبیت کو قربان کر دیا۔ ترجمہ لفظ بلفظ ہونے کے بجائے اگر free ہوتا اور صرف مفہوم کو سمجھ کر انگریزی زبان میں اس کو ادا کیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ اس کو درست کرنا نیا ترجمہ کرنے سے زیادہ مشکل ہے"۔ (ایضاً ' ص ۵۵)

مشرقی پاکستان کے نامور مفکر اور ادیب فرخ احمد صاحب کے انتقال پر ان کے صاحبزادے سید عبداللہ المسعود کو لکھتے ہیں:

"فرخ احمد صاحب کی ادبی تخلیقات "ست ساگر ماجھی" (سات سمندروں کا ملاح) سراجا منیرا اور حاتم طائی وغیرہ بنگلہ اسلامی ادب کے شاہکار ہیں۔ فرخ احمد صاحب کو علامہ اقبال سے والہانہ عشق تھا اور انھوں نے اردو اور فارسی اساتذہ کی مدد سے اقبالیات کا تفصیلی مطالعہ کر کے ان سے روشنی و رہنمائی حاصل کی تھی اور بہت سی نظموں کا بنگلہ میں ترجمہ کیا تھا۔ وہ اپنے انداز تخاطب اور زبان و بیان میں ٹیگور کے مدمقابل تھے۔ اگرچہ دونوں کے پیش نظر مقاصد یکسر مختلف تھے۔ نام نہاد ترقی پسند انھیں ہمیشہ رجعت پسند مسلمان قرار دیتے تھے ' لیکن مرحوم اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ان پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے ' مگر اللہ نے انھیں معجزانہ طور پر بچالیا۔

"بنگلہ دیش" بنے تین سال گزر چلے لیکن انھوں نے اس کے حق میں آج تک ایک لفظ تک نہ کہا یا لکھا"۔ (ایضاً، ص ۵۱۴)

جیلانی بی اے کے شوق افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آپ کی طبیعت کا رجحان اگر مختصر افسانے لکھنے کی طرف ہے تو اس کو نشوونما دیجیے اور بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے افسانے بکثرت دیکھ کر یہ سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ کسی خاص نقطہ نظر کو ناظرین کے ذہن میں غیر محسوس طور پر افسانے کے ذریعے سے اتار دینے کا کیا طریقہ ہے۔ افسانے کے عیوب میں سے یہ ایک بڑا عیب ہے کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس ہو جائے کہ افسانہ نگار ان کے اندر کیا نقش بٹھانا چاہتا ہے اور افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو نقش آپ بٹھانا چاہتے ہیں وہ آپ سے آپ بیٹھ جائے، بغیر اس کے کہ قاری کا ذہن قبل از وقت چوکنا ہو کر اس اثر کو resist کرنے پر آمادہ ہو۔ اس فن کو خصوصیت کے ساتھ روسی افسانہ نگاروں سے سیکھیے جنھوں نے اشتراکیت کی تبلیغ میں اس سے بہت کام لیا ہے۔ آپ اپنی ایک نہیں بلکہ دو چار کہانیاں مجھے نمونے کے طور پر بھیجیں، میں انھیں دیکھ کر پھر آپ کو رائے دوں گا۔

"ایک اور طریقہ کھلم کھلا افسانے کے ذریعے سے کسی چیز کی تبلیغ کرنے کا بھی ہے، مگر اس صورت میں لکھنے والے کو بہت زیادہ قادر الکلام اور قوی الاستدلال ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے زور بیان سے ناظرین کو اپنے ساتھ بہالے جائے۔ میں آپ کے افسانے دیکھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ آپ ان دونوں طریقوں میں سے کس طریقے میں کامیاب ہو سکیں گے"۔ (ایضاً، ص ۲۸۹) (جاری)

اخبار امت

افغانستان: نئی امیدیں ' نئے خطرات

عبدالغفار عزیز

زخموں سے چور افغانستان ایک بار پھر اپنی تاریخ کے اہم موڑ پر کھڑا ہے۔ چار برس سے باہم متصادم فریق اب باہم گفت و شنید کے ذریعے اپنے اختلافات طے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تصادم کے دو اہم فریقوں جمعیت اسلامی (پروفیسر برہان الدین ربانی) اور حزب اسلامی (انجینئر گلبدین حکمتیار) نے امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد کو مشترکہ دعوت دی ہے کہ آپ جہاد کے ہر مرحلے میں ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ اب ایک بار پھر کوشش کیجیے کہ افغانستان میں جنگ کی یہ آگ بجھ جائے۔ اس وقت پہلی بار یہ محسوس ہو رہا ہے کہ متخاصم فریق باہم صلح کے لیے پورے خلوص سے آمادہ ہیں۔ کیونکہ گزشتہ لڑائیوں کے بعد سب کو یہ یقین ہو چکا ہے کہ فریق مخالف کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی کوششوں کے ذریعے افغان مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے بات چیت اور تقسیم اختیارات کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

۱۹۹۲ میں جب نجیب حکومت کا خاتمہ ہو رہا تھا تو سالہا سال سے نظر آنے والا یہ خطرہ سنگین سے سنگین تر ہو رہا تھا کہ روس کی حلیف حکومت کے خاتمے کے بعد مجاہد تنظیموں کے باہمی اختلافات افغانستان کو باہمی لڑائی کی آگ میں نہ جھونک دیں۔ اس صورت حال کا ادراک کرتے ہوئے دنیا بھر سے جہاد سے مخلص مسلم رہنما پشاور میں آکر جمع ہوئے کہ سوویت یونین اور سوشلزم کو قصہ پارینہ بنا دینے والے افغان مجاہدین خود اس فتح کے ثمرات سے محروم نہ ہو جائیں۔ قاضی حسین احمد اس وقت تقریباً ایک ماہ تک پشاور میں متحرک رہے اور افغان زعما اور پاکستانی ذمہ داران حکومت سے ملاقاتیں کر کے یہی سعی کرتے رہے کہ کسی نہ کسی طرح دونوں بڑی افغان تنظیموں جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کے ساتھ دوسری پانچوں افغان تنظیموں کو متحد کر دیا جائے۔ عین اسی وقت عالمی قوتیں اس امر کے لیے کوشاں تھیں کہ افغانستان میں اسلامی حکومت کا قیام ناممکن بنا دیا جائے اور جو بے تحاشا اسلحہ روسیوں نے پیچھے چھوڑا ہے اسے افغانوں کی باہمی جنگ میں خاکستر کرتے ہوئے مجاہدین اور ان کے

اسلحے دونوں سے جان چھڑالی جائے۔اس مقصد کے لیے سب سے آسان نسخہ یہ تھا کہ افغانستان کی دونوں بڑی تنظیموں میں سے کسی ایک کو مجوزہ حکومت سے باہر کر دیا جائے۔اپریل ۹۲ میں اس سازش کے بیج یوں بوئے گئے کہ حزب اسلامی (گلبدین حکمتیار) کو کابل سے باہر رکھا جائے اور حزب اور جمعیت کے درمیان صلح و اتحاد کی کسی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔وہ دن اور آج کا دن، اب تک پوری افغان قوم، پاکستان اور امت اسلامیہ اس سازش کے کسیلے پھل کاٹ رہی ہے۔ سولہ سالہ روسی تسلط کے دوران افغانستان کے اکثر علاقے زمین بوس ہو چکے تھے۔کابل اور دوسرے جو چند علاقے باقی بچے تھے وہ ان چار سالوں میں خاکستر ہو گئے۔اس دوران صلح و اتحاد کی مختلف کوششیں ہوتی رہیں۔تقریباً سب اسلامی تحریکوں نے اپنے اپنے وفود کے ذریعے مجاہدین کو ایک کرنے کی کوشش کی۔اس دوران باہمی صلح کے لیے کئی مسودے تیار ہوئے۔ایک ایک شق کے لیے کابل اور چہار آسیاب کے درمیان دسیوں چکر لگائے اور پھر ان مسودوں کی بنیاد پر اسلام آباد میں ایک معاہدے کا اعلان بھی ہو گیا۔مکہ مکرمہ اور تہران میں بھی اس پر مہر تصدیق ثبت کی گئی لیکن افغانستان کے اندر اور باہر موجود ان سازشی عناصر نے اس معاہدے پر عمل درآمد نہ ہونے دیا جو چاہتے تھے کہ افغانستان میں امن و امان قائم نہ ہو، اور وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے افغانستان کے راستے پاکستان اور عالم اسلام سے منسلک ہونے سے مسلمانوں کے عروج کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو جائے۔

اس دوران اقوام متحدہ نے بھی افغانستان میں صلح کے لیے کوششیں کیں، لیکن ان کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کو اپنی امن پسندی کا ثبوت دیا جا سکے اور اس طرح ان عالمی سازشوں کو بھی پردہ مہیا کیا جائے جو افغانستان میں باہمی لڑائی کو مزید جڑ کاٹنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔دوسرا مقصد یہ تھا کہ افغانستان میں جہادی روحانی لذت سے آشنا ہو جانے والے امت مسلمہ کے نوجوانوں کے آیندہ عزائم کے راستے مسدود کیے جائیں۔اس آرزو میں تڑپنے والے نوجوان جو فلسطین، کشمیر، بوسنیا اور دیگر اسلامی خطوں میں اپنی جان سے گزر جانے کے لیے تیار ہیں، مغرب کو "دہشت گرد" نظر آتے ہیں۔

ان خطرات کے مداوے کے لیے ضروری تھا کہ باہمی جنگ کے خاتمہ کے لیے کوششیں کی جائیں۔ ۱۹۹۶ کے آغاز تک یہ کوششیں کامیابی کی کسی امید سے آشنا نہیں ہو سکی تھیں۔ ۹۶ کے آغاز میں انھی دو بڑی افغان قوتوں کی طرف سے صلح کی خواہش کا اظہار و اعادہ کیا گیا جنھیں ۹۲ اور اس سے قبل باہم ملانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ قاضی حسین احمد کو دعوت دی گئی کہ آپ دوبارہ افغانستان تشریف لائیں اور پہلے جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کے درمیان صلح کی سعی کریں اور پھر ان دونوں کی طالبان کے ساتھ یک جائی کی کوشش کریں۔ قاضی صاحب نے پہلے اپنے مختلف وفود بھیجے۔اور پھر اپریل ۹۶ کے وسط میں خود افغانستان آ گئے۔پہلے جلال آباد میں انجینئر حکمتیار سے ملے،

پھر صدر ربانی کے خصوصی طیارے میں کابل آئے جہاں صدر ربانی' انجینئر احمد شاہ مسعود' شیخ سیاف' حزب وحدت کے رہنماؤں' سلفی رہنما مولوی سمیع اللہ اور دیگر تمام موجود رہنماؤں سے تفصیلی مذاکرات کیے۔

یہ پہلی بار تھا کہ سب مجاہد لیڈروں نے سابقہ روایات سے ہٹ کر رویہ اختیار کیا اور اپنے مطالبات پہ اصرار کے بجائے دوسروں کے لیے اپنے حقوق سے دستبرداری کا عندیہ دیا۔ ان مذاکرات کے نتیجہ میں جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کے درمیان متعدد امور پہ اتفاق رائے ہو چکا ہے۔ لیکن افغانستان کے مکمل امن و استحکام کا انحصار اب صرف ان دونوں تنظیموں کے اتحاد پر منحصر نہیں ہے بلکہ کچھ عرصہ قبل ابھرنے والی تنظیم طالبان بھی اب افغان مسئلے کا ایک اہم عنصر ہے۔ اس لیے صدر ربانی اور انجینئر حکمتیار باہم قریب آنے کے بعد اس امر پر غور وخوض کر رہے ہیں کہ طالبان کو ساتھ ملا کر اتحاد و صلح کی ایک مضبوط مثلث تشکیل دی جائے۔ قاضی صاحب کا تجزیہ یہی ہے کہ کوئی فریق بھی دوسرے فریق کو ملیامیٹ کر کے مسئلہ افغانستان کو حل نہیں کر سکتا۔ حتمی حل کے لیے تمام فریقوں کو جلد یا بدیر بات چیت اور صلح و اتحاد پر مجبور ہونا پڑے گا۔ بصورت دیگر سارے فریق ناکام رہیں گے اور کامیاب صرف اسلام دشمن قوتیں ہوں گی۔

اس صورت حال میں تحریک طالبان کے سامنے تین ممکنہ راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ صلح کی ان کوششوں میں شریک نہ ہوں اور جنگ پر ہی اصرار کریں۔ اس صورت میں طالبان کو جمعیت اور حزب کی مشترکہ قوت کا سامنا کرنا پڑے گا اور عین ممکن ہے کہ ابھی تک کسی مزحمت کا سامنا نہ کرنے والے طالبان جس تیزی سے ابھرے ہیں اسی تیزی سے ختم ہوتے چلے جائیں۔ یہ خطرہ اس لیے بھی زیادہ ہے کہ اس وقت طالبان کی صفوں میں انتشار میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ جن لوگوں نے اس نعرے پر ان کا ساتھ دیا تھا کہ ہم باہم متصادم جماعتوں سے افغانستان کو نجات دلا دیں گے وہ اب سوال کر رہے ہیں کہ جب متصادم فریق باہم صلح کر رہے ہیں تو ہم لڑائی کا کیا جواز رکھتے ہیں۔ یہ اضطراب بھی بڑھ رہا ہے کہ ان تنظیموں نے کسی کفر بواح کا ارتکاب تو نہیں کیا' اس صورت میں ہم صرف اپنی حکومت کے قیام کے لیے کیوں جنگ پر اصرار کریں۔ بہت سے طلبہ اپنی کامیابی ناممکن دیکھتے ہوئے اپنی نامکمل تعلیم مکمل کرنے پر اصرار کر رہے ہیں کہ ہم ایک طویل' بے فائدہ اور شرعی بنیاد نہ رکھنے والی جنگ کی خاطر اپنا مستقبل کیوں تاریک کریں۔ انتشار کی اس کیفیت میں طالبان کے لیے یہ فیصلہ دشوار ہو گا کہ وہ صلح کے بجائے جنگ پر ہی اصرار کریں۔

تحریک طالبان کے لیے دوسرا راستہ یہ ہے کہ وہ باہم قریب آتی ہوئی افغان تنظیموں کی صلح کی پیشکش قبول کر لیں اور افغانستان میں امن و استحکام اور مشترکہ حکومت کے قیام کے سنہری موقع کو

ضائع نہ ہونے دیں۔ طالبان کے ساتھ گہری وابستگی رکھنے والی حکومت پاکستان کی طرف سے بھی اسی راستے کو سراہنے کے اشارے دیے جارہے ہیں۔

طالبان کے لیے تیسرا راستہ یہ ہے کہ وہ دونوں تنظیموں کی صلح کی پیشکش کو قبول نہ کریں اور دونوں کی مشترکہ قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے جنرل دوستم سے اتحاد کرلیں۔ یہ فیصلہ طالبان اور افغان قوم کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہو گا۔ اس سے ایک تو طالبان کی اپنی قوت بکھر جائے گی اس لیے کہ اسلامی سلطنت کے نعرے پہ مجتمع ہونے والے طالبان دوستم سے اتحاد کو تنظیم کی اساس اور اصل ہدف سے روگردانی قرار دیتے ہوئے اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور دوسرے یہ کہ اس اتحاد کے وجود میں آنے کے بعد افغانستان کی تقسیم کی بنیاد مضبوط تر ہو جائے گی۔

اس اہم موڑ پر سب سے اہم کردار پاکستانی حکومت کا ہے۔ اگر وہ ایک بار پھر نواز شریف والی غلطی کا ارتکاب کرتے ہوئے افغان تنظیموں کو ملانے کی کوشش کرنے کے بجائے انھیں پھر لڑائی کی طرف دھکیل دے اور پاکستان کو ان تمام روشن امکانات سے محروم کر دے جو صرف افغانستان کے امن و امان سے وابستہ ہیں تو افغانستان اور پاکستان پھر سالہا سال کے لیے عدم استحکام کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس وقت پاکستانی حکومت کے لیے موقع ہے کہ وہ دونوں قریب آتی ہوئی افغان تنظیموں کو مزید قریب تر کر دے اور دونوں کے تعاون میں اب بھی جو بے اعتمادی اور مشکلات حائل ہیں انھیں دور کرنے کی تگ و دو کرے اور اس طرح افغانستان میں مزید اثر و نفوذ کے خواب دیکھنے والے بھارت کی راہ مسدود کر دے۔ بھارت نے گزشتہ عرصے میں پاکستان اور افغان حکومتوں کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو مزید بڑھانے کی پوری کوشش کی ہے اور اس صورت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے قدم مضبوط کرنے کی بھی۔ کابل میں قائم پاکستانی سفارت خانے پر حملے اور پشاور میں پھٹنے والے بم کے واقعات کی تحقیق کرنے والوں کے ہاتھ اب یہی سراغ آرہا ہے کہ ان واقعات کے پیچھے اصل ہاتھ بھارت کا تھا اور اس نے ان واقعات کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بھرپور طور پر استعمال بھی کیا ہے تاکہ پاکستان و افغانستان جو دوران جہاد یک جان دو قالب کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، انھیں ایک دوسرے سے دور کیا جائے۔

اب یہ حکومت پاکستان کی دانش مندی کا امتحان ہے کہ وہ اپنے ازلی دشمن کی چالوں کا ادراک کرتے ہوئے افغانستان کی حکومت سے اپنے اختلافات کو انا کا مسئلہ نہ بنا کر اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھا کر پاکستان و افغانستان کے استحکام کی پالیسی اپناتی ہے یا حکومت پاکستان بھی تقسیم افغانستان کے اسی ناپاک منصوبے کو کامیاب کرنے کی سازش کا حصہ بنتی ہے جس کے تحت شمال میں دوستم اور مغرب و جنوب مغرب میں طالبان کو علاحدہ علاحدہ ریاستوں میں بانٹ دینے کا خواب دیکھا جا رہا ہے۔

آنے والے چند روز اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ ان میں جمعیت و حزب (ربانی' حکمتیار) کے درمیان اتحاد کی کوششوں کے نتائج بھی سامنے آنا ہیں کہ وہ اس میں حائل گراں رکاوٹوں کو دور کر پاتے ہیں یا نہیں۔ انھی دنوں میں طالبان کو دونوں تنظیموں کی صلح کی پیشکش کا جواب دینا ہے کہ وہ افغانستان کے سنہری دور کے آغاز کا باعث بنتے ہیں یا افغانستان اور خود اپنے وجود کو نئے خطرات سے دوچار کر دیتے ہیں۔ پاکستانی حکومت کی طرف سے پالیسی کے تعین کا انتظار ہے کہ وہ امن' صلح اور استحکام کے روشن امکانات کو کامیاب بنانے کی سعی کرتی ہے یا وہ بھی سابقہ حکومت کی طرح ان کوششوں میں روڑے اٹکا کر تاریخ کے صفحات میں ایک نئے سیاہ باب کا اضافہ کر دیتی ہے۔

حکومت پاکستان کے پاس اپنی پالیسی طے کرنے کے لیے بہت تھوڑا وقت بچا ہے کیونکہ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور عالمی قوتوں کی کوشش ہے کہ افغانستان میں امن کی جانب بڑھتے قدم پھر سے پلٹ جائیں اور طالبان کو دو قریب آتے بھائیوں کے اتحاد سے خوفزدہ کر کے ایک نئی جنگ مسلط کر دی جائے۔

جوہر داؤد کے بعد

مسلم سجاد

گروزنی شہر سے ۳۵ کلومیٹر جنوب مشرق میں قصبہ Gekhichu میں ۲۱ اور ۲۲ اپریل کی درمیانی شب امت مسلمہ کے اس دور کے رجل عظیم صدر جوہر داؤد کی شہادت' احیاے اسلام کے ''خطرے'' سے نبٹنے کے لیے روس اور امریکہ کی متحدہ کوششوں اور سازشوں کا علامتی اظہار تھی۔ باوثوق ذرائع کی اطلاع کے مطابق چیچن جدوجہد آزادی کے اس عظیم رہنما کو منظر سے ہٹانے کا فیصلہ صدر کلنٹن اور صدر یلسن کی گذشتہ ون ٹو ون ملاقات میں ہوا۔ دسمبر ۹۴ میں صرف دو ہفتوں میں مسئلہ حل کر دینے کے دعووں کے ساتھ روسی فوج کا چیچنیا پر حملہ بھی اس سے قبل بوڈاپسٹ کانفرنس میں امریکہ اور برطانیہ سے آشیرباد حاصل کر کے کیا گیا تھا جب کہ روسی پارلیمنٹ ڈوما اور فوجی قیادت کا موثر حصہ قفقاز کے ماضی کی تابناک روایات جہاد کی بنیاد پر اس مہم جوئی کے خلاف تھا۔

روس اور امریکہ کی عظیم طاقتوں کو دس بارہ لاکھ آبادی کی اس ننھی منی ریاست سے ایسا کون سا خطرہ درپیش ہے کہ اسے مطیع فرمان بنانے کے لیے ہر طرح کے اسلحہ سے لیس ۴ لاکھ فوج میدان میں اتار دی گئی ہے جس نے شہری آبادیوں پر رونگٹے کھڑے کر دینے والے مظالم کیے ہیں۔ دراصل مغرب کے حکمراں' ہمارے حکمرانوں کی طرح کوتاہ نظر اور اپنی قوم اور تہذیب کے مفادات سے بے نیاز نہیں ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اس دنیا کو اپنی تہذیب کے لیے مسخر کرنے میں جو سب سے

بڑی رکاوٹ ان کو نظر آرہی ہے 'اسے دور کرنے میں وہ سب ایک ہیں۔ کشمیر بے چارہ تو کسی گنتی میں نہیں کہ خود حکومت پاکستان امداد سے انکار میں پیش پیش ہے۔ فلسطین کا مسئلہ بھی یاسر عرفات نے "حل" کر دیا ہے اور عرب ممالک اسرائیل سے دوستیاں بڑھا رہے ہیں۔ بوسنیا میں بھی خوب اچھی طرح سبق سکھا کر سمجھوتہ کرا دیا گیا ہے لیکن یہ چیچنیا یہاں کے سرفروشوں نے تو روسی فوج کا ناطقہ بند کر دیا ہے' حوصلے پست کر دیے ہیں اور عزت خاک میں ملا دی ہے۔ یلسن کی ۱۶ جون کے صدارتی انتخاب میں کامیابی مشکوک ہوتی جارہی ہے۔ اگر چیچن کامیاب رہتے ہیں تو پورے قفقاز میں آزادی کی لہروں پر قابو پانا ممکن نہ رہے گا۔ افغانستان میں روس کی شکست کے بعد' وہاں احیاے اسلام کا مرکز بن جانے کے امکانات کو ایجنٹوں کے ذریعے آپس کی لڑائیاں کروا کے دور کیا گیا ہے' کہیں چیچنیا سے یہ رو شروع ہو کر طاقت نہ پکڑ لے۔

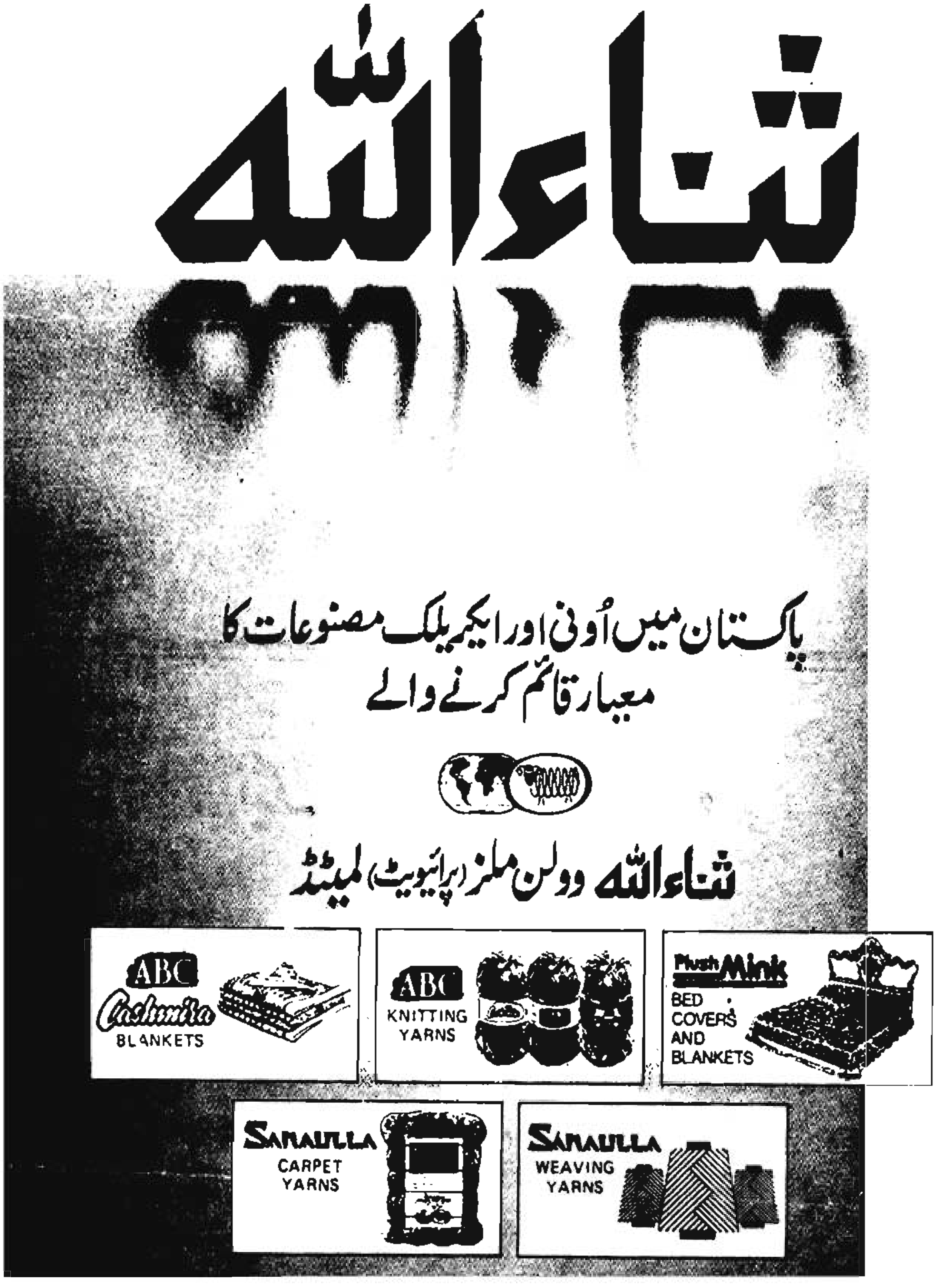
یہ وجہ ہے کہ امریکہ یلسن کو ہر طرح کی امداد دے رہا ہے۔ چیچنیا پر حملے کے چند دن بعد ہی آئی ایم ایف نے روس کو ۲ء۶ بلین ڈالر کی ریکارڈ امداد مہیا کی جو تمام کی تمام چیچنیا پر فوج کشی میں خرچ ہوئی۔ روسی' صدر جوہر داؤد کی جان لینے کی کئی ناکام کوششیں کر چکے تھے۔ بالآخر امریکہ کی تکنیکی امداد سے وہ اس میں اس وقت کامیاب ہوئے جب وہ مراکش کے شاہ حسن کے ایک معاون سے فون پر بات کر رہے تھے جسے روسی حکومت نے صلح کی بات چیت کے لیے نامزد کیا تھا۔ اس واقعہ میں نئے وزیر خارجہ ۳۵ سالہ عماد الدین قربانوف بھی شہید ہو گئے۔ روسیوں کا خیال تھا کہ اس طرح انتشار پیدا ہو جائے گا اور روس کوئی حل تھوپ سکے گا۔ نئے صدر زیلم خان کی آپس کی لڑائی میں شہادت کی خبر بھی اڑائی گئی۔ ان کے دو ساتھی چیف آف آرمی سٹاف اسلان مشکوادوف اور شامل بسایوف ہیں۔ مغربی ذرائع اپنی اس خواہش کو چھپا نہیں پا رہے ہیں کہ ان میں صدارت کے لیے لڑائی ہو (شامل خود قیادت سنبھالنے کے لیے بے چین ہے۔ اکنامسٹ ۴ مئی) لیکن صورت حال یہ ہے کہ زیلم خان بھی زندہ ہیں' صفوں میں مکمل اتحاد ہے' مجاہدین زیادہ فعال ہو گئے ہیں' روسی فوج کو مسلسل نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ زیلم خان نے اعلان کیا ہے کہ ہم اپنے صدر کی شہادت کا انتقام روسی عوام سے نہیں لیں گے۔

چیچنیا کا جہاد نہایت دور رس اثرات کا حامل ہے۔ امریکی اور یورپی ذرائع ابلاغ کھلے عام اعتراف کرتے ہیں کہ روس کو چیچنیا میں فوجی شکست ہو چکی ہے۔ صرف سازشوں کے ذریعے اپنے کو الجھا رکھا ہے۔ ایک سیاسی شکست کے بعد' چیچنیا روس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

یہ سیاسی شکست شاید دور نہیں ہے۔ یلسن کے سیکورٹی چیف کورزانوف (نیوز ویک کے مطابق اس کے "راسپوتین") نے انتخابات ملتوی کرنے کی آواز بلند کر دی ہے۔ ہم پاکستانی اس طرح کے

التوا کی وجوہات کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ خانہ جنگی ہو جائے گی۔ امیدواروں میں سے کمیونسٹ امیدوار زیا گونوف کی کامیابی کے امکانات ہیں۔ کلنٹن پر تنقید ہو رہی ہے کہ سب داؤ یلسن پر لگانے سے 'روس امریکہ کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ یلسن کی شکست کی صورت میں عالمی منظر پر فیصلہ کن اثرات ہوں گے۔ یلسن چیچنیا کا مسئلہ حل کرنے کے لیے بے چین ہے تاکہ اس کی کامیابی یقینی ہو جائے۔

لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ امت مسلمہ کے چند درد مند عناصر کے علاوہ 'عوامی اور حکومتی سطح پر کسی کو صورت حال کی سنگینی کا احساس نہیں ہے۔ مغرب کو اپنے مفادات کی فکر ہے لیکن مسلمان خصوصاً ان کے حکمران ملی مفادات سے بے نیاز ہیں بلکہ مغرب کے مفادات کو پورا کرنے میں پیش پیش ہیں۔ چیچنیا کے جہاد اور جوہر داؤد رحمہ اللہ کی شہادت کا اصل پیغام یہ ہے کہ امت مسلمہ میں بیداری کی عام لہر پیدا کی جائے۔ یہ امت ایسی جسد واحد ہو جائے کہ ایک عضو کی تکلیف پر پورا جسم تڑپے۔ تب ہی کسی کو مسلمانوں پر ہاتھ اٹھانے کی جرات نہ ہوگی۔ یہ بیداری اور اس کے نتیجے میں قیادت کی تبدیلی ہی امت کا اصل دفاع ہے۔ امام شامل کا ربع صدی تک جاری رہنے والا جہاد بھی اس لیے فتح مند نہ ہوا کہ مسلمان قوموں کے اسلحہ خانوں پر تالے لگے رہے اور ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔


ثناءاللہ
پاکستان میں اُونی اور ایکریلک مصنوعات کا
معیار قائم کرنے والے
ثناءاللہ وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ABC Cashmira BLANKETS
ABC KNITTING YARNS
Plush Mink BED COVERS AND BLANKETS
SANAULLA CARPET YARNS
SANAULLA WEAVING YARNS

بحث و نظر

کچھ عدالتی فیصلے کے بارے میں

سلیم منصور خالد

پاکستان کی عدالت عظمٰی کے فیصلے پر نہایت وقیع اور جامع "اشارات" (مئی ۹۶) پڑھنے کو ملے۔ اس کے مندرجات اور استدلال سے اتفاق رکھنے کے باوجود ایک دو مقامات پر اتفاق کرنا ذرا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر جسٹس منیر مرحوم کی جانب سے پہلی دستور یہ توڑنے کی تائید کی وجہ 'حکومتی دباؤ کو قرار دینا غالبا قرین قیاس نہیں۔ یہ چیز ان کے سیکولر رجحانات کا فطری اظہار تھا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ پاکستان جہاں قومی ادارے کسمپرسی کے عالم میں ہیں' وہاں judge-made-laws کا کچھ زیادہ دروازہ کھولنے کی تائید دکھائی دیتی ہے۔ یہی نکتہ اختلاف ہے۔ سچی بات ہے کہ ہمارے منتخب قومی نمائندے سیکولر اپروچ یا معروف اصطلاح میں ناپسندیدہ کہلائے جانے کے باوجود دینی شعائر اور دین کے خلاف فیصلے دینے یا قانون سازی کرنے میں جری اور بے خوف نہیں ہیں' جب کہ گوشہ عدل میں بیٹھے ہوئے افراد اپنے آپ کو یکسر آزاد تصور کرتے ہیں۔

منیر انکوائری رپورٹ ہو' حدیث و سنت کی آئینی حیثیت کا مسئلہ ہو' توہین رسالت کا سوال ہو' ختم نبوت کا مسئلہ ہو یا قرار داد مقاصد اور اسلامی شعائر یا اسلام کے عائلی قوانین کی تفہیم کا معاملہ ' ان میں چند مثالوں کو چھوڑ کر بڑی ہی دل گرفتہ صورت دکھائی دیتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم ایک سیکولر اور سوشلسٹ منشور پر بھرپور کامیابی سے ہم کنار ہوئے تھے' مگر اس کے باوجود قادیانی مسئلہ (۱۹۷۴) اور دستور میں اسلامی شقوں کے پہلے سے بھی بہتر کرنے پر آمادہ ہوئے۔ اسی طرح بعد کی اسمبلیاں آٹھویں ترمیم کی اسلامی شقوں کے خلاف تمام تر شوروغوغا آرائی میں گھر جانے کے باوجود یہ جسارت نہ کر سکیں کہ وہ انھیں چھیڑتیں۔ مگر سپریم کورٹ نے جسٹس نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں "حاکم خاں کیس" (۱۹۹۲) میں قرارداد مقاصد کی روح کو مسخ اور حیثیت کو مجروح کر کے رکھ دیا۔ آج منظر یہ ہے کہ دستور میں آرٹیکل ۲۔الف کی موجودگی کے باوجود "قرارداد مقاصد" دستور کا محض نمائشی اور غیر موثر حصہ بن کر رہ گئی ہے' حالانکہ آٹھویں ترمیم نے اسے دستور کا موثر حصہ بنایا تھا۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے نے عدالتی عمل میں اسلامی قانون کی تمام پیش رفت کو عمل معکوس کا شکار

کرایا ہے۔

اسی طرح موجودہ فیصلے میں سپریم کورٹ نے بنیادی سوال کا جواب دینے سے تجاوز کرتے ہوئے بے جا طور پر فیڈرل شریعت کورٹ (FSC) کی روح سلب کر دی ہے۔ یہ وہ کام ہے جو طاقت ور سیکولر لابی پورا زور لگا کر پارلیمنٹ سے نہ کروا سکی تھی۔ شریعت کورٹ کے بارے میں یہ جملہ کہ "یہ عدالت ہی نہیں" بڑا ظلم ہے۔ حالانکہ عدالت' شریعت کورٹس میں ججوں کو بالجبر بھیجنے کی روش پر اسی طرح قدغن تجویز کر سکتی تھی' جس طرح اسمبلی توڑنے کے صدارتی اختیار پر کیا گیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کن اصحاب عدل کے ہاتھ میں بغیر کسی گرفت اور جوابدہی کے 'اختیار' دینے کی تائید کی جا رہی ہے؟ کیا ان لوگوں کے جو اسلام اور اسلامی قانون کی کتب مستشرقین اور مشنریوں کی مدد سے پڑھنا علمی معراج سمجھتے ہیں' قرآن اور حدیث کے معیاری' غیر معیاری ترجموں کو دیکھ کر اور تشکیک زدہ مصنفوں سے حرارت حاصل کر کے مطلق اجتہاد کا حق چاہتے ہیں' پھر اپنے فیصلوں کے دفاع کے لیے دلیل سے زیادہ توہین عدالت کے قانون بلکہ گرز کا سہارا لیتے ہیں۔

ہرچند کہ اشارات میں یہ بڑا ہمدردانہ اور منصفانہ مشورہ دیا گیا ہے کہ عدلیہ آرٹیکل ۲۔الف والے اپنے فیصلے (حاکم خان کیس) سے رجوع کر کے اپنے عدالتی activism کا وسیع دروازہ کھول سکتی ہے مگر حقیقت میں ہمارے اصحاب عدل کی اکثریت' چاہے وہ کرسی عدل پر بیٹھی ہو' یا مجرموں کو چھڑانے اور مظلوموں کا حق سلب کرانے کے پیشے سے منسلک ہو' وہ آرٹیکل ۲۔الف سے جان چھڑانا چاہتی ہے' کیونکہ اینگلو سیکسن قانون کی وادیاں انھیں زیادہ مرغوب ہیں اور ۲۔الف کا رخ اسلامی عدل و انصاف کی طرف ہے جو مقدمات کا جنگل صاف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی طرح عدالت عظمیٰ نے پوری کی پوری آٹھویں ترمیم کو "مارشل لا کا گناہ" قرار دے کر بڑا ہی غیر معروضی حکم لگایا ہے۔ دوسری جانب مارشل لا کی اسی ترمیم کے تحت ججوں نے اپنی ملازمتوں' مراعات' بلوچستان ہائی کورٹ کے قیام' سینیٹ میں ماہرین کی نشستوں کے اضافے وغیرہ کو خوش دلی سے قبول بھی کیا ہے۔

غرض یہ ہے کہ جس سوسائٹی میں ہم آج سانس لے رہے ہیں' ان میں سے کسی ایسے ادارے کو' کہ جس پر کوئی گرفت نہ کر سکتا ہو' کوئی سوال نہ اٹھا سکتا ہو' اسے قانون سازی کا وسیع اختیار سونپ دینا رائے عامہ کو یرغمال بنا دینے یا اپنی دریا دلی اور غصے کا شکار کر دینے کے ہم معنی بن جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ ایسا اختیار' عدالتی آمریت "عدالتی شریعت" آخر کار عدالت سے ٹکراؤ اور اس کے جائز احترام کو ملیامیٹ کر دینے پر منتج ہو گا۔ اس لیے سب کو چاہیے کہ وہ اس قابل احترام ادارے کو بچانے کے لیے غصے اور محبت سے بالاتر ہو کر توازن کا راستہ اختیار کریں۔ ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کی یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہی ہوئی ہیں۔

رسائل و مسائل

خواتین کی تنظیم اور شریعت

کیا خواتین کی تنظیم قائم کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے؟ کیا رسول اکرمؐ اور دور خلفاؓ میں ایسی کوئی تنظیم قائم ہوئی؟ خواتین کی تنظیم کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

آپ کے سوالات سے خوشی ہوئی کہ اسلام کے لیے کام کرنے والی خواتین مسائل پر سنجیدگی سے غور بھی کرتی ہیں اور ان کی سوچنے اور غور کرنے کا رخ بھی صحیح ہے۔ آپ کا پہلا سوال تو عملی ہے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور تربیت و اصلاح اور دینی صالح انقلاب کے لیے خواتین کی تنظیم کے بارے میں عام طور پر اس طرح کے سوالات اٹھا کر غلط فہمیاں اور نتیجتاً بددلی' دانستہ یا نادانستہ پھیلائی جاتی ہے۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ اس سلسلے میں ذہن بالکل صاف ہو۔ دوسرے دو سوال علمی ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اصولی حقیقت ہمہ وقت سامنے رکھنی چاہیے اور اسلام پر ایمان و یقین رکھنے والا مرد ہو یا عورت' جب بھی اس کے سامنے عملی زندگی میں کچھ کرنے یا نہ کرنے 'کسی کام کو اختیار کرنے یا ترک کرنے کا سوال ابھرے' تو اسے فوراً پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھنا چاہیے کہ دور رسالتؐ میں اس کے لیے کیا ہدایات اور کیا نمونہ ملتا ہے؟ اختیار کرنے اور اپنانے کے لائق صرف وہی عمل اور وہی نظریہ ہے جس کی تائید قرآن و حدیث' اور رسولؐ کی عملی زندگی سے ہوتی ہو۔ عملی زندگی کا کوئی بھی انفرادی یا اجتماعی معاملہ ہو' مسلمان مرد اور عورت کے لیے ہرگز یہ گنجائش نہیں ہے کہ وہ قرآن و سنت اور رسول پاکؐ کی عملی زندگی سے بے نیاز ہو کر کوئی رویہ اختیار کرے۔ حالات کے تقاضے خواہ کچھ ہی ہوں' ماحول کا دباؤ جو بھی ہو' اس اصولی ہدایت پر مومن کے ذہن و فکر کی گرفت ہرگز کمزور نہ ہونا چاہیے۔

اس اصولی ہدایت اور حقیقت کے بعد اب ہم آپ کے پہلے سوال پر غور کرتے ہیں۔ دراصل انسانی تہذیب و تمدن کے مظاہر' سائنس اور ٹیکنالوجی اور اجتماعی اور جمہوری شعور میں برابر ارتقا ہو رہا ہے اور اجتماعی زندگی میں انضباط کا احساس برابر ترقی پذیر ہے' اس لیے دور حاضر کی بہت سی چیزوں کے لیے دور سعادت میں بعینہ مثال اور ہو بہو نمونہ ملنا مشکل ہی نہیں' ممکن بھی نہیں ہے۔ لیکن ملت اسلامیہ کے لیے چونکہ سرچشمہ ہدایت صرف قرآن و سنت اور دور رسالت کی عملی زندگی ہی

ہے، اس لیے شرح صدر کے ساتھ ہر مسئلہ میں اسی کی طرف رجوع کریں گے، اور فطری طور پر وہیں سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو چیزیں اس وقت نہیں تھیں یا نہیں ہو سکتی تھیں، ان میں قرآن و سنت کی اصولی ہدایات و اشارات، اور دین و شریعت کی روح اور مزاج کو پیش نظر رکھ کر حتی الامکان وہ عمل اختیار کرنے کی کوشش کریں گے، جو زیادہ سے زیادہ قرآن و سنت کی ہدایات اور دین و شریعت کے منشا اور مزاج کے مطابق اور اس سے قریب تر ہو گا۔ اس طرح قرآن و سنت کو مرجع ہدایت سمجھ کر اس کی روشنی میں اپنی انفرادی یا اجتماعی زندگی میں جو لائحہ عمل ہم تجویز کریں گے، وہ دینی عمل ہو گا اور دین کا تقاضا سمجھ کر ہم اس پر عمل کریں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی دینی حیثیت کے معاملے میں کسی شک اور شبہ میں پڑیں۔

خواتین کی تنظیم کے سلسلے میں آپ اس طرح غور کیجیے کہ دور رسالتؐ میں جو بھی خاتون اسلام لاتی تھی وہ قدرتی طور پر اس جماعت کی رکن اور ممبر بن جاتی تھی، جو نئی جماعت کافروں اور مشرکوں کے مقابلے میں وجود میں آ رہی تھی اور قدرتی طور پر یہ ابھرتی ہوئی جماعت منظم ہو رہی تھی۔ اس وقت خواتین کی تنظیم کا نہ سوال اٹھتا تھا نہ کوئی ضرورت داعی تھی، جس طرح کی آج ضرورت داعی ہے۔ آج آپ خواتین کی تنظیم کی بات کیوں سوچ رہی ہیں؟ اسی لیے کہ خواتین مل جل کر دین کا تعارف حاصل کریں، فطری انداز میں دین کی دعوت و تبلیغ کا منصبی فریضہ انجام دیں، اجتماعیت کا احساس پیدا کریں، معاشرے میں اصلاح اور سدھار کی مہم چلائیں اور خواتین کی قوت کو منظم کر کے سماج میں ایک صالح انقلاب لانے کا خوشگوار فریضہ انجام دیں۔ غور کیجیے، یہ سارے کام نہ صرف جائز بلکہ واجب اور مطلوب ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں ایمان لانے والی اور اسلامی جماعت کی ممبر بننے والی ہر خاتون یہ فرائض انجام دیتی تھی۔ یہ سارے کام براہ راست ایمان کا تقاضا اور مومن خاتون کی منصبی ذمہ داری ہے۔ اسی دینی ذمہ داری کو بحسن خوبی انجام دینے اور دین کے اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے خواتین کی تنظیم کی ضرورت ہے، اور یہ خالص دینی و شرعی ضرورت ہے۔

یہ ضرورت اس لیے سامنے آئی کہ عرصہ دراز سے مردوں نے بھی اور عورتوں نے بھی اپنی اس منصبی ذمہ داری کو فراموش کر دیا تھا، بلکہ دینی فرائض اور احکام سے ہی غفلت برتنے لگے تھے۔ بہت سی خواتین اور مرد تو ایسے ہیں، جو دین کے بنیادی عقائد اور بنیادی احکام ہی سے غافل اور ناواقف ہیں۔ اگر امت مسلمہ بحیثیت مجموعی اپنے فرائض انجام دے رہی ہوتی اور امت میں ایک اصولی جماعت ہونے اور اصولی جماعت بن کر زندگی گزارنے کا احساس زندہ ہوتا تو خواتین کی تنظیم کی نہ ضرورت محسوس ہوتی اور نہ یہ سوال ہی اٹھتا۔ لیکن اس وقت جو صورت حال ہے اور غفلت، انتشار

اور دین سے بے تعلقی کی جو عام کیفیت پائی جا رہی ہے، اس کیفیت میں خواتین کو ایک اصولی جماعت ہونے کا احساس دلانا، ایک اصولی جماعت کی حیثیت سے ان کو منظم کر کے دین سیکھنے سکھانے اور معاشرے میں اصلاح و انقلاب کے لیے کوشش کرنے کے کام میں لگانا اور منظم انداز میں اپنے منصبی فرائض کو انجام دینے کے لیے خواتین کی تنظیم کرنا، نہ صرف جائز اور مباح ہے، بلکہ ایک دینی اور شرعی ضرورت ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا ارشاد ہے "اسلام بغیر جماعت نہیں اور جماعت بغیر امارت نہیں اور امارت بغیر اطاعت نہیں"۔ ظاہر ہے یہ ارشاد جس طرح مردوں کے حق میں صحیح ہے، ٹھیک اسی طرح عورتوں کے حق میں بھی صحیح ہے۔ یہ نظام مطلوب ہے مگر آج یہ نظام بکھر چکا ہے۔ اب جو خواتین دوبارہ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے کوشش کریں وہ قابل مبارک باد ہیں۔ دین کے تعارف و اشاعت، دین کی دعوت و حفاظت اور دین کو عملی زندگی میں جاری و ساری کرنے کی اجتماعی جدوجہد کے لیے خواتین کی جو تنظیم قائم کی جائے، وہ خالص دینی عمل ہے۔ خواتین کی ایسی اسلامی تنظیم میں منصبی فرائض انجام دینا، نظم کے تقاضے پورے کرنا، تجویز کردہ پروگرام اور لائحہ عمل پر عمل کرنا اور منصوبے کے مطابق علمی اور عملی کوششیں اور کاوشیں کرنا سراسر دینی فریضہ ہیں۔ اسی تصور کے ساتھ ان کاموں کو انجام دینا چاہیے۔ اشاعت دین اور انفرادی و اجتماعی زندگی میں تزکیہ کے لیے تنظیم کے طے کردہ اہداف کو دل کی لگن اور ذوق و شوق کے ساتھ ادا کرنا اللہ اور رسولؐ کی اطاعت ہے اور اس میں غفلت و کوتاہی اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی ہے۔ خواتین کی دینی تنظیم کی یہی شرعی حیثیت ہے۔

(محمد یوسف اصلاحی)

دعوت و تبلیغ کے لیے عورت کا باہر نکلنا

اکثر بہنوں کو ان کے والدین دعوت و تبلیغ کا کام کرنے کے لیے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتے اور دوسروں کے یہاں آنے جانے پر روک لگاتے ہیں۔ اب جو بہنیں دعوت و تبلیغ کا کام کرنا چاہتی ہیں تو وہ والدین کی مرضی کے خلاف ہو گا۔ ایسی صورت میں کیا دعوت کے لیے باہر نکلنا والدین کی نافرمانی قرار دیا جائے گا؟

موجودہ خراب ماحول میں جب کہ انسانی اخلاق بہت بگڑ چکے ہیں اور ہر طرف بے حیائی اور بے شرمی عام ہے۔ والدین کا اپنی بچیوں کی طرف سے فکرمند اور ہر جگہ آنے جانے پر روک لگانا فطری بھی ہے اور پسندیدہ بھی۔ والدین کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے سماج میں عزت و وقار کی زندگی گزاریں اور خاص طور پر بچیاں نیک نام اٹھیں اور والدین ہی بچیوں کے سب سے بڑے خیر خواہ ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔

نوعمری میں عقل خام ہوتی ہے۔ عیاروں اور جعل سازوں کی مکاریاں بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتیں۔ پھر شیطان اپنی ذریت کے ساتھ ہروقت گھات میں لگا ہوا ہے کہ نیکی کی راہ پر کوئی برائی کا شوشہ چھوڑے اور نیکی کی راہ مارے۔ ایسے میں برائیوں کی طرف جانے کی راہیں فراخ اور مواقع بے شمار ہیں اور نیکیوں کی راہ پر جانا بلکہ نیکی پر قائم رہنا دشوار ہے۔ پردے کی ڈھیل بلکہ بے پردگی کے رواج نے خطرات میں پڑ جانے کے اندیشے اور زیادہ یقینی سے بنا دیے ہیں اور خدانخواستہ کوئی غلط بات یا غلط فہمی، بدگمانی کی بنا پر ہی سہی، پھیل جائے تو والدین کی زندگی مستقل طور پر اجیرن ہو جاتی ہے۔ زندگی صرف بے مزہ ہی نہیں ہو جاتی بلکہ مستقل مصیبت بن جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں ماں باپ اگر بچیوں کے گھومنے پھرنے اور عام طور پر لوگوں کے یہاں آنے جانے پر پابندی لگاتے ہیں تو صرف یہی نہیں کہ پسندیدہ ہے بلکہ ان کی ذمہ داری ہے اور اس معاملہ میں انھیں ہرگز کوتاہی نہیں کرنا چاہیے۔

خدانخواستہ کسی کے کردار اور اخلاق کے بارے میں بے بنیاد ہی سہی، کوئی ناروا بات پھیل جائے اور دامن پر کوئی داغ لگا دے تو آپ سوچیے سماج میں ایسے شخص کی کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ اس داغ کے ساتھ سماج میں یوں بھی عزت و وقار کی زندگی نہیں رہتی۔ پھر بھلا ایسے شخص کی دعوت و تبلیغ کون سنے گا، اور کون اس سے متاثر ہو گا؟ یہ خطرہ بلاشبہ یقینی نہیں ہے لیکن اپنے کو خطرات میں ڈالنے سے بچنا اور احتیاط کرنا بہرحال لازم ہے۔ جواں سال بہنوں کو چاہیے کہ وہ ماں باپ کے روک ٹوک کو حق بجانب سمجھیں اور اس کے خلاف عمل کرنے کو ہرگز دین کا تقاضا سمجھ کر نافرمانی نہ کریں۔

رہا یہ سوال کہ تحریکی بہنیں دعوت و تبلیغ کا کام کیسے کریں اور اس فریضے کو کیسے انجام دیں تو اس سلسلے میں یہ بات نگاہ میں رکھیں کہ دعوت و تبلیغ کا فریضہ دین نے آپ پر کچھ حدود و شرائط کے ساتھ واجب کیا ہے۔ تبلیغ کا شوق اور جذبہ بلاشبہ قابل قدر ہے، لیکن اس شوق اور جذبہ کے لیے ان حدود کو توڑنا ہرگز جائز نہیں ہے جو خدا کے دین نے آپ کے لیے مقرر کی ہیں۔ پردے کا اہتمام بھی ضروری ہے، تہمت کے مواقع سے بچنا بھی ضروری ہے، جہاں بے احتیاطی اور اختلاط کا اندیشہ ہو وہاں سے کنارہ کش رہنا بھی ضروری ہے اور خراب ماحول میں آزادانہ گھومنے پھرنے اور ہر ایک کے یہاں بے روک ٹوک جانے سے پرہیز بھی ناگزیر ہے۔ جہاں غلط بات منسوب ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہو، وہاں سے اجتناب بھی ضروری ہے۔ ہر ممکن احتیاط کے ساتھ آپ ان ہی گھروں میں جائیں جہاں آپ کو جانے کے لیے والدین اطمینان کے ساتھ اجازت دیں۔ پھر اپنے گھر، خاندان اور رشتہ داروں میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے لیے مواقع کی کوئی کمی نہیں۔ بہن بھائیوں میں کام کریں، پڑوسیوں سے دعوتی روابط بڑھائیں، رشتہ داروں اور تعلق رکھنے والوں میں داعی کی حیثیت سے اپنا

تعارف کرائیں اور اپنے شب و روز کی زندگی اور دینی سرگرمیوں سے متعلقین کو دین کی طرف متوجہ کریں۔ البتہ کہیں خواتین کا اجتماع ہو اور ان کے ساتھ دو چار دن گزارنے کے مواقع ہوں تو اس میں شرکت کے لیے والدین سے حکمت کے ساتھ اجازت لیں، بشرطیکہ آنے جانے کا کوئی محتاط بندوبست ہو۔ تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ بلاشبہ خواتین کے لیے نہایت ضروری فریضہ ہے۔ لیکن ان تمام حدود اور احتیاطوں کے ساتھ جو اللہ نے مقرر فرمائی ہیں.... یہ ناگزیر اور ضروری نہیں ہے کہ آپ دوسروں کے یہاں جاکر ہی دعوت و تبلیغ کا کام کریں اور اسی کو دعوت و تبلیغ کا کام سمجھیں۔ احتیاط کے ساتھ جو فطری مواقع آپ کو حاصل ہیں، ان سے فائدہ اٹھائیں۔ خدا نے اتنا ہی آپ پر فرض کیا ہے اور یہ بھی اسی طرح آپ کا دینی فرض ہے کہ اپنے اخلاق و کردار کو بے داغ رکھنے کا اہتمام کریں۔ اپنے جوہر عفت و عصمت کی حفاظت کے لیے ہر ممکن احتیاط کریں اور اس کو اپنا سب سے بڑا فرض سمجھیں۔

اگر اللہ نے آپ کو قلم کی صلاحیت سے نوازا ہے، تو آپ باہر جاکر دعوت دینے کے مقابلے میں قلم سے دعوت پھیلانے میں زیادہ دلچسپی لیں۔ [یہ] دیرپا بھی ہوتی ہے، اس کا فائدہ عرصے تک باقی رہتا ہے اور ان لوگوں تک بھی تحریر کی رسائی ہو جاتی ہے جو اجتماعات میں کسی وجہ سے نہیں آ پاتیں۔ پھر قلم سے کام لینے والیوں کی تعداد بھی بہت کم ہوتی ہے۔ بلکہ خال خال ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں جس خاتون کو بھی اللہ نے اس خاص صلاحیت سے نوازا ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قلم سے فائدہ اٹھانے میں انتہائی سنجیدہ ہو، اور دوسری چیزوں میں خود کو مصروف کرنے کے بجائے زیادہ توجہ اسی طرف دے۔ توقع ہے کہ وہ قلم کے ذریعے زیادہ کام انجام دے سکے گی۔ (م - ی - ا)

عورت کی ملازمت

میں ایک انتہائی پسماندہ دور دراز علاقہ کا باشندہ ہوں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اسلام میں عورت کو تعلیم حاصل کرنے اور پھر تعلیم کے بعد باپردہ ملازمت کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ نیز عورت تعلیم یافتہ ہو اور باپردہ ملازمت کرنا چاہے جب کہ شوہر روکے، اس صورت میں بیوی اور خاوند کے درمیان یا سسرال والوں کے درمیان ناراضگی کا سماں پیدا ہو جائے، ایسی صورت میں کیا حکم ہے؟ اس معاملے میں خاوند کو بیوی پر کتنا اختیار حاصل ہے۔ کیا خاوند بیوی کی ایسی خواہش کو عمر بھر دبا سکتا ہے؟

بیوی کا خرچہ شوہر پر واجب ہے اور بیٹی کا خرچہ باپ پر واجب ہے۔ اس لیے عورت پر ملازمت کرنا ضروری تو نہیں ہے مگر ممنوع بھی نہیں ہے، اگر کوئی خاتون شرعی پردے کی پابندی کرتے ہوئے کوئی جائز ملازمت کرتی ہے یا کاروبار کرتی ہے اور گھر کے اخراجات پورے کرنے میں اپنے شوہر یا اپنے والدین یا اپنے بھائیوں کی مدد کرتی ہے، تو یہ ایک اچھا کام ہے جس کا ان شاء اللہ اسے اجر ملے

گا۔ البتہ پردے کے احکام کی خلاف ورزی کرنا یا مردوں اور عورتوں کی مخلوط مجالس و دفاتر میں بلاپردہ کام کرنا جائز نہیں ہے۔ (گوہر رحمان)

دینی کتب اور قرض حسن

قلمی و زبانی اشاعت و تبلیغ میں اپنی سی سعی و کاوش کے علاوہ مالی طور پر کتب خرید کر دینا کیا اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کے زمرہ میں آتا ہے؟ یا راہ حق میں جہاد کرنے کی تعریف میں؟ صراحت مطلوب ہے؟

دین کی اشاعت و تبلیغ اور دین کی اقامت و غلبے کی کوششوں میں اپنی بساط بھر مومن جو ذہنی ' فکری ' جسمانی ' مالی 'کوشش و کاوش بھی کرے گا ' وہ راہ حق میں بلاشبہ جہاد ہی ہے۔ قلم سے بھی جہاد ہوتا ہے اور جان کھپا کر اور جان دے کر بھی جہاد ہوتا ہے۔

اس وقت جب کہ ہر طرف باطل کا غلبہ ہے ' خدا کا دین مغلوب ہے ' لوگ دین سے ناواقف بھی ہیں اور دین کے خلاف ہر طرح کی فکری اور عملی مخالف کوششیں بھی ہو رہی ہیں ' ایسے حالات میں جس بندے کو جو پونجی میسر ہے ' خواہ وہ مال ہو یا صلاحیتیں ' زبان کی طاقت ہو یا قلم کی ' بندہ جس طرح بھی دین کی اشاعت و اقامت میں لگے گا ' ان شاء اللہ وہ سب کچھ جہاد میں شمار ہو گا۔ دین کا تعارف کرانے اور دین کو لوگوں میں مقبول بنانے اور اسلام کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے جو شخص اپنا مال خرچ کر کے دینی کتب خرید کر تقسیم کرے اور لوگوں تک پہنچائے ' وہ یقیناً خداوند عالم کو قرض حسن دے رہا ہے۔ اس دور میں یہ بہترین قرض حسن ہے ' جس پر اللہ سے اچھی امیدیں وابستہ کرنا چاہییں۔ خداوند عالم ہم سب کو اپنی جان ' مال اور جملہ صلاحیتوں سے اپنی راہ میں جدوجہد کرنے کی توفیق بخشے ' آمین۔

دور حاضر کتابوں کا دور ہے۔ کتابوں کے ذریعے دعوت و تبلیغ اور خدا کے دین کی اقامت کے جو مواقع آج پیدا ہو گئے ہیں ' اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ طباعت اور اشاعت کی جو سہولتیں اور ذرائع اس وقت میسر ہیں ' ان سے فائدہ اٹھانا اور ان میں دین کی اشاعت اور دین کی اقامت کی خاطر اپنا دل پسند مال لگانا یقیناً اللہ کو قرض حسن دینا بھی ہے اور جہاد بالمال بھی ' اور یقیناً اس مہم میں شرکت کی سعادت پر اللہ سے اجر و صلے کی توقع رکھنا بجا ہے۔ لیکن کتاب کے ساتھ عمل ' حسن سلوک اور لگن بھی ہو ' اور رب العالمین کے حضور ان کے پر اثر ہونے کی دعا بھی! (م - ی - ا)

"منافع" کمانے کا موقع

ایک تاجر کو نیہ ... معمولی مالی نقصان ہو جانے پر یہ خط لکھا گیا۔

کل رات ہی مجھے پتہ چلا کہ آپ پر بیٹھے بٹھائے کتنی بڑی مصیبت آگئی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کا سہارا بنے اور نہ صرف آپ کے نقصان' بلکہ آپ کے صبر کی بھی جزا دے اور صبر کا انعام بہت بڑا ہوتا ہے۔

مسلمان کتنا خوش قسمت ہے۔ اگر اللہ اُسے کوئی نعمت عطا کرے تو وہ اس کا شکر ادا کرتا ہے اور اللہ اس شکر پر اسے مزید انعام عطا کرتا ہے۔ اگر اس پر کوئی مصیبت آجائے اور وہ اسے صبر سے برداشت کر لے تو اللہ اس پر بھی انعام دیتا ہے۔ یہ بات ہمیں اللہ کے رسولؐ نے بتائی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا کوئی بھی واقعہ نہ اچھا ہوتا ہے نہ برا۔ یہ تو اللہ سے تجارت کرنے اور بڑے بڑے منافع کمانے کا موقع ہوتا ہے۔ چاہے یہ مال کا نفع و نقصان کا معاملہ ہو یا بیماری اور صحت کا۔ اس لیے میں دعا کرتا ہوں کہ آپ "تجارت" کے اس موقعے کا پورا فائدہ اٹھائیں اور اللہ سے اپنا پورا منافع وصول کریں۔ جو آپ سے ایک رات میں چھن گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک لمحے میں کئی گنا عطا کر سکتا ہے اور جو کچھ آپ پوری زندگی میں جمع کریں اللہ تعالیٰ پلک جھپکتے آپ سے لے سکتا ہے۔ ان سب کی اپنی کوئی قیمت نہیں۔ اس دنیا کی تمام دولت کی آخرت میں ایک مچھر کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں جن سے وہ بالاخانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت 'جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں' سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے۔ (الزخرف ۴۳: ۳۳) یقیناً ان سب کا لطف تو زندگی کے آخری سانس تک ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔

جو کچھ آپ سے لیا گیا ہے وہ آپ کا نہیں' اللہ کا ہے۔ اور جو کچھ آپ کو دیا گیا ہے وہ بھی اسی کا ہے۔ ایک دفعہ آپ اس بات کو سمجھ لیں تو آپ ہر آزمائش کا وقار کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

ایک موقع پر آپ نے آگے بڑھ کر اپنی کچھ آمدنی اللہ کی راہ میں دینے کا عہد کیا تھا' اب شیطان آپ کے دل میں طرح طرح کے اندیشے لا سکتا ہے۔ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ. شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے۔ اس لیے اپنے بچاؤ کی فکر کریں۔

آپ کی مرضی کے خلاف جو کچھ آپ سے لیا گیا ہے وہ واپس دیا جا سکتا ہے' اور اس پر انعام بھی دیا جا سکتا ہے' لیکن جو کچھ اللہ کی راہ میں آپ اپنی مرضی سے دیں گے وہ کم سے کم سات سو گنا یا اس سے بھی زائد ہو کر آپ کو ملے گا' اس لیے حوصلہ نہ ہاریے' آگے بڑھتے رہیے۔ (خرم مراد' ترجمہ: م-س)

قرآن کے مطابق:

اگر کوئی مسلمان رسول اللہؐ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کرے، تو وہ مسلمان نہیں رہتا۔ (ایسے ایک شخص کی حضرت عمرؓ نے گردن اڑا دی تو ان سے پرسش نہ کی گئی)

آج ہماری روز مرہ زندگی کی کتنی ہی باتیں ہیں جن کے بارے میں رسول اللہؐ کی ہدایات --- کوئی مقدمہ لے جائے بغیر ھی، آپ کے فیصلے --- موجود ہیں۔

ہم انھیں جانتے بھی ہیں،

پر ہم انھیں عملاً تسلیم نہیں کرتے!

اور اپنے ایمان سے مطمئن بھی ہیں!!

(بندۂ خدا)

کتاب نما

مطالعہ تصوف، قرآن و سنت کی روشنی میں، ڈاکٹر غلام قادر لون۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دہلی ٦۔ صفحات: ٦٥٠۔ قیمت: ١١٠ روپے۔

تصوف کا عنوان اور موضوع اس اعتبار سے مشکل، پیچیدہ اور متنازع رہا ہے کہ کثرت تعبیر کی وجہ سے اسے بعض لوگوں نے اسلام کی روح اور مذہب قرار دیا اور بعض نے اسے غیر اسلامی رہبانیت قرار دے کر مسترد کر دیا۔ بعض لوگوں نے وضاحت کے لیے "اسلامی تصوف" اور "عجمی تصوف" کی اصطلاحوں کا سہارا لیا۔ شاید اسی مشکل کے پیش نظر زیر نظر کتاب کے عنوان کے ساتھ مصنف نے "قرآن و سنت کی روشنی میں" کا لاحقہ لگانا ضروری خیال تھا۔

پی ایچ ڈی کے زیر نظر تحقیقی مقالے میں مصنف نے بڑی کاوش اور محنت کے ساتھ عربی و فارسی کے بنیادی مآخذ کی مدد سے موضوع کی تفصیلات اور اطراف و جوانب پر مہارت و علمیت سے بحث کی ہے۔ وہ تصوف کی مختلف اصطلاحات کو بھی زیر بحث لائے ہیں اور اس کے جملہ پہلوؤں اور تمام قابل ذکر صوفیا کے اقوال اور صوفیانہ رویوں پر بھی کلام کیا ہے۔ باعث اطمینان یہ ہے کہ مصنف نے ہر بات کو قرآن و حدیث کے معیار پر پرکھا ہے۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی کے بقول: "فکر اسلامی کے اس اہم ترین شعبے تصوف کے متعلق وہ پھیلا ہوا مواد، جو اس کتاب کے ذریعے سے سامنے آرہا ہے، غالباً اب تک کے مطبوعہ ذخیرے میں اس کی نظیر ملنی مشکل ہے" اور "تصوف سے مثبت وابستگی کے حلقوں کے لیے بھی یہ کتاب دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ تصوف کی باتیں اس میں جس طرح شرح و بسط کے ساتھ بے آمیز طریقے پر آگئی ہیں، وہ اپنے آپ میں قیمتی ہیں، جن سے ہر شخص، حسب توفیق و صلاحیت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اسقاط الوسائط، شطحات، اور رجال الغیب کی بحثیں خاص طور پر دلچسپی کی ہیں جن پر اس قدر وافر مواد غالباً اردو زبان میں پہلی بار سامنے آرہا ہے"۔

ایک اہم موضوع پر یہ بلند پایہ کتاب اچھے اور قابل اطمینان معیار پر شائع کی گئی ہے۔ کتابیات اور اشاریہ بھی شامل ہے۔ گرانی کے دور میں ایسی ارزاں کتاب، شائقین کے لیے ایک نعمت ہے۔

(ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

مطالعہ قرآن سے پہلے، میر محمد حسین، ناشر: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، صفحات: ۲۱۲۔ قیمت: ۹۳ روپے۔

میر محمد حسین آرزومند ہیں کہ مسلمانوں کا قرآن مجید سے رشتہ جوڑا جائے اور اسے مستحکم کیا جائے تاکہ فکر و عمل کی دنیا میں انقلاب برپا ہو۔ اس آرزو کی تکمیل کے لیے انھوں نے اپنا قلم وقف کر دیا ہے اور اب تک ایسی تین کتابیں تحریر کر چکے ہیں جن کے ذریعے قرآن حکیم کے بارے میں علم و آگہی میں اضافہ ممکن ہے۔ پہلی کتاب "مضامین قرآن" ہے جو کلام حکیم کے مضامین و مطالب کا اشاریہ ہے۔ دوسری کتاب کا نام "تسہیل القرآن" ہے جس میں ضروری قواعد کی توضیح کے ساتھ ساتھ قرآن مجید میں استعمال ہونے والے جملہ الفاظ کے مادے اور اردو میں ان کے استعمال کے حوالے سے ان کے معانی دیے گئے ہیں تاکہ ہر شخص معمولی کاوش سے براہ راست قرآن مجید کو سمجھنے کی استعداد پیدا کر سکے۔ "مطالعہ قرآن سے پہلے" اس سلسلے کی تیسری کتاب ہے۔

اس کتاب میں قرآن مجید کے مطالعے کے سلسلے میں ضروری امور و نکات مثلاً ناسخ و منسوخ، جمع و تدوین اور ترتیب سور، سبعۃ احرف، حروف و مقطعات، محکمات و متشابہات، اعجاز قرآن اور تفسیر و تاویل وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ یہ اس نوع کی پہلی کتاب نہیں۔ اس سے قبل بھی ایسی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن زیر تبصرہ کتاب کی خوبی اس کا اختصار، جامعیت اور آسان زبان و بیان ہے، جس کی بدولت عام اردو خواں لوگ بھی ان امور سے واقف ہو سکتے ہیں جو کسی نہ کسی حوالے سے قرآن فہمی کے لیے ضروری ہیں۔ اگر کتاب میں مندرج آیات کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دے دیا جاتا تو اس کے فائدے میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ بہرحال موجودہ صورت میں بھی کتاب بہت مفید ہے۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

Let us Live as Muslims، جلیل احسن ندوی۔ مترجم سعید اللہ قاضی، محمد بوستان خان۔ ناشر: شیخ زاید سنٹر برائے اسلامک و عربک سٹڈیز، پشاور یونی ورسٹی، صفحات: ۳۰۰۔ قیمت: ۳۰۰ روپے / ۲۰ ڈالر۔

"راہ عمل" کے نام سے مجموعہ احادیث اردو دان طبقہ میں قبول عام حاصل کر چکا ہے۔ جناب سعید اللہ قاضی نے مذکورہ مجموعے کو انگریزی کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ نیت، عقائد، عبادات، معاملات، سماجی زندگی، اخلاقی معاملات، نیک اعمال، دعوت الی اللہ، داعی کی خصوصیات، طریق اصلاح، آں حضرتؐ کا اسوۂ حسنہ اور اصحاب رسولؐ کا طرز عمل جیسے اہم موضوعات تیرہ ابواب میں سمیٹ دیے گئے ہیں۔ کتاب میں ۴۲۱ احادیث مع تشریح شامل ہیں۔

مترجمین نے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے کہ مذکورہ کتاب کے مخاطب وہ حضرات ہیں جن کی مادری زبان یا مطالعے کی زبان انگریزی ہے۔ اس سلسلے میں اگر کچھ اصطلاحات مثلاً: خطبہ' سنت' نکاح' زکوٰۃ' جہاد' سحر' دعا' صدقہ' نفل' دین' صلوٰۃ اور تہجد کی وضاحت حواشی میں دے دی جاتی تو انگریزی دان حضرات اس سے اور زیادہ استفادہ کر سکتے۔ کچھ اسلامی اصطلاحات ایسی ہیں جن کے مفہوم کو ہوبہو پیش کرنے کے لیے مترادف الفاظ موجود نہیں ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ کے لیے poor due کا لفظ ناکافی ہے کیوں کہ یہ لفظ صدقے کا معنی تو رکھتا ہے' پاکی اور تزکیے سے اس کا علاقہ نہیں ہے۔ ایسے الفاظ بہرحال تشریح کے محتاج ہوتے ہیں۔ مترجمین نے اگرچہ بڑی محنت کے ساتھ تشریحات کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا ہے مگر کہیں کہیں احساس ہوتا ہے کہ اگر اصل کتاب کی تشریحات کی بجائے یا ان کے ساتھ مترجمین اپنی جانب سے بھی کچھ تشریحات کر دیتے تو بہت اچھا تھا۔

کتاب کی خوبی یہ ہے کہ عربی متن بھی انگریزی ترجمے کے ساتھ دیا گیا ہے اور انگریزی میں تلفظ واضح کرنے کے لیے stress pattern بھی استعمال کیا گیا ہے۔ بڑھیا کاغذ اور معقول طباعت نے کتاب کے حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ چند مقامات پر پروف کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ نبی رحمتؐ کے نام کے ساتھ PH کے بجائے SAW لکھنا زیادہ مناسب تھا۔ پاکستانی طلبہ' خصوصاً مقابلے کے امتحان میں شریک ہونے والوں کے لیے' یہ ایک نادر تحفہ ہے۔ (محمد ایوب منیر)

سوانح حضرت ابو سفیان بن حربؓ' ابن عبدالشکور۔ ناشر: کوثر پبلی کیشنز' بنگلور۔ صفحات: ۲۳۶' قیمت: ۵۰ روپے۔

جس طرح ختمی مرتبت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تمام کمالات و صفات کی جامع اور انسانیت کی معراج ہے' اسی طرح آں حضورؐ کے صحابہ کرامؓ سیرت و کردار کے اعتبار سے اتنے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہیں کہ انبیا علیہم السلام کو چھوڑ کر ان سے بہتر کسی انسان پر آفتاب طلوع نہیں ہوا۔ حضرت ابو سفیانؓ بن حرب اسی مقدس جماعت کے ایک معزز رکن تھے۔ بعض لوگ ان پر یہ کہہ کر زبان طعن دراز کرتے ہیں کہ وہ قبول اسلام سے پہلے اسلام کی مخالفت میں بہت سرگرم رہے اور جب اسلام قبول کیا تو وہ بھی صدق دل سے نہیں بلکہ جان کے خوف سے کیا۔ یہ لوگ اپنے موقف کے حق میں جو دلائل پیش کرتے ہیں' وہ اتنے کمزور اور کھوکھلے ہیں کہ کسی صحیح العقیدہ شخص کے لیے انھیں تسلیم کرنا بہت مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے صحابہ کرامؓ قبول اسلام سے پہلے اسلام کے مخالف تھے لیکن قبول اسلام کے بعد انھوں نے اپنے حسن عمل سے اپنے سابقہ اعمال کی تلافی کر دی اور یوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کی بشارت کے مستحق ٹھہرے۔ یہ الگ بات ہے کہ مراتب

کے اعتبار سے ان کے درمیان فرق ہے لیکن اس سے ان کے شرف صحابیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

زیر نظر کتاب میں جناب ابن عبد الشکور نے حضرت ابو سفیان کے سوانح حیات کا تفصیل کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ وہ متعدد دوسرے صحابہ کرامؓ کے سوانح حیات بھی کتابی صورت میں لا چکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری ہے۔ صحابہ کرامؓ کی سیرت نگاری بہت ہی مبارک کام ہے اور اس کے لیے فاضل مولف تحسین و ستایش کے مستحق ہیں، لیکن یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تالیفات جہاں قاری کی طبیعت میں انشراح کا باعث ہوتی ہیں، وہاں یہ تاثر بھی پیدا کرتی ہیں کہ کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لیے اس میں بہت سی غیر متعلقہ باتیں بھی درج کر دی گئی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں بہت سا ایسا مواد ہے جس کا اصل موضوع سے براہ راست تعلق نہیں بنتا۔ نیز ایسی روایات بھی درج کر دی گئی ہیں جن سے ذم یا تنقیص و تعریض کا پہلو نکلتا ہے۔ اس کے برعکس بعض ایسی روایات سے صرف نظر کیا گیا ہے جن سے حضرت ابو سفیان کی زندگی کے بعض روشن پہلو سامنے آتے ہیں۔ شاید ایسی روایات مولف کی دسترس سے باہر رہیں۔ لاریب صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے تھے اس لیے ان کی سیرت پر قلم اٹھاتے وقت نہ صرف ادب و احترام کا لحاظ رکھنا ضروری ہے بلکہ بڑی احتیاط اور دقت نظر کی ضرورت بھی ہے۔ مناقب کی حد تک تو بعض صورتوں میں ضعیف روایتوں کو قبول کیا جا سکتا ہے لیکن جن روایتوں میں کسی بھی صاحب رسولؐ کے بارے میں تنقیص یا تعریض کا پہلو پایا جاتا ہو، ان کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیے۔

اگرچہ زیر تبصرہ کتاب میں حضرت ابو سفیانؓ کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں، پھر بھی ہماری دیانت دارانہ رائے ہے کہ یہ اپنے مندرجات اور زبان و بیان کے اعتبار سے اس معیار پر پوری نہیں اترتی جو مولف کی دوسری کتابوں کا ہے۔ امید ہے فاضل مولف اس پر نظر ثانی فرمائیں گے اور اسے دوبارہ اس انداز میں مرتب کریں گے کہ قاری کے دل میں حضرت ابو سفیانؓ کے بارے میں کوئی ناخوش گوار تاثر ابھرنے نہ پائے۔ (طالب الہاشمی)

صلاح الدین ایوبی، اسٹینلے لین پول۔ ترجمہ و تلخیص: آباد شاہ پوری۔ ناشر: بک پروموٹرز، جناح سپر مارکیٹ، اسلام آباد۔ صفحات: ۱۴۵۔ قیمت: درج نہیں۔

عالمی منظر نامہ آج کل مغرب اور اسلام کی جس کش مکش کا آئینہ دار ہے، اسے صلیبی جنگوں کا تسلسل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان حالات میں اگر صلاح الدین ایوبی یاد نہ آئے تو کون یاد آئے کہ جناب مترجم کے مطابق: آج مسلم امہ قیادت کے بحران میں مبتلا ہے اور مغربی قومیں اس پر اس

طرح ٹوٹ پڑی ہیں جیسے کوئی بھوکا دسترخوان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے صلاح الدین ایوبی جیسی شخصیت درکار ہے۔ اسٹینلے لین پول کی شہرہ آفاق کتاب کو بنیاد بنا کر، آباد شاہ پوری نے اپنی پر تاثیر اور رواں دواں زبان میں ایک پورے دور کی داستان کش مکش بیان کر دی ہے۔ یقیناً اب جنگ بارھویں صدی کے طرز پر نہیں لڑی جاتی، لیکن انسانی فطرت و نفسیات، غیروں کی عہد شکنیاں، اپنوں کی بے وفائیاں تو آلات جنگ بدل جانے سے تبدیل نہیں ہو جائیں گی۔ مسلمان قوموں کی قیادت جن عناصر کے ہاتھ میں ہے اور وطن فروشی اور غداری کے جو کڑوے پھل امت کے نصیب میں آرہے ہیں، اس کی جھلک اس دور میں بھی مل جاتی ہے۔ صلاح الدین ایوبی کا اصل کارنامہ یہی ہے کہ اس نے شکست خوردہ قوم میں امید اور حوصلے کا دیا روشن کیا اور کامیابیاں حاصل کر کے دشمن کو پسپا کر دیا۔ بیت المقدس کی فتح اس لحاظ سے یادگار ہے کہ ۴۰ روز تک شہر کے باشندے، معاہدے کے مطابق، کوئی نقصان اٹھائے بغیر شہر خالی کرتے رہے، جب کہ اس سے قبل عیسائیوں نے یہ شہر فتح کیا تھا تو روایات کے مطابق شہر کی گلیوں میں مسلمانوں کا خون اس طرح بہایا گیا کہ دشمن کے گھوڑوں کی ٹانگیں اس میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ آج جب بوسنیا، چیچنیا، لبنان، اراکان، تاجکستان، فلپائن، کشمیر، ہر جگہ مسلمان اپنے خون سے اپنے نئے عروج کا آغاز کر رہے ہیں، صلاح الدین ایوبی کی داستان ان کے لیے منزل فتح کا نشان ہے۔ اس کے کارناموں کو سمجھنے کے لیے کتاب کے ساتھ ایک اچھے تفصیلی نقشے کی ضرورت تھی۔ (مسلم سجاد)

ماہنامہ **حجاب** رام پور، مدیرہ: ام صہیب۔ نگران: ڈاکٹر ابن فرید۔ مقام اشاعت: بیت الصالحہ زینہ عنایت خان، رام پور، یوپی۔ بھارت۔ صفحات: ۱۲۸۔ قیمت: ۱۰ روپے۔ سالانہ: ۱۲۰ روپے۔

تبصرہ نگار کے سامنے بھارت سے نکلنے والے خواتین و طالبات کے اس رسالے کے جنوری، فروری، مارچ اور اپریل ۹۶ کے شمارے ہیں جن میں فروری کا ۲۵۶ صفحات کا حقوق نسواں نمبر بھی ہے۔ سچ یہ ہے کہ کبھی کبھار ہی کوئی ایسا رسالہ نظر پڑتا ہے جسے دیکھ کر، پڑھ کر دل کو وہ خوشی حاصل ہو جو ان رسائل سے ہوئی۔ خواتین آج کے عالمی اور مسلم معاشرے کا اہم موضوع ہیں، اور شدید ضرورت ہے کہ انھیں مناسب راہ نمائی فراہم ہو۔ بھارت کی تحریک اسلامی کی خواتین نے اس سے عہدہ برآ ہو کر ایک خلا کو پر کیا ہے۔ یقیناً اسے پاکستان کے چمک دمک والے رسائل کے مقابل نہیں رکھا جا سکتا لیکن اپنے مضامین، موضوعات اور لوازمے کے تنوع اور معنوی افادیت کے لحاظ سے "حجاب" ان سے کہیں زیادہ معیاری اور مفید رسالہ ہے۔ مسلم خاتون کے لیے جدید تہذیب کے پیدا کردہ مسائل ہر جگہ یکساں ہیں۔ "حجاب" میں پاکستان کی خواتین کے لیے اور خواتین کے رسائل شائع کرنے

والوں کے لیے بہت کچھ حسب حال ہے۔ ہر رسالے میں کلام باری تعالیٰ اور کلام خیرالانامؐ کے علاوہ ۴ ' ۵ افسانوں ' نظموں کے ساتھ خواتین کے مسائل کے حوالے سے کئی تازہ طبع زاد تحریریں شامل ہوتی ہیں۔ ضخیم "حقوق نسواں نمبر" میں تو شاید ہی آج کا کوئی مسئلہ زیر بحث آنے سے رہ گیا ہو۔ پھر یہ کہ نئے نئے لکھنے والے ہیں جن کی تر و تازہ تحریریں دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ ایک افسانہ ان دادی صاحبہ پر ہے جو تیسری پوتی کی ولادت پر گھر چھوڑنے کو تیار ہیں۔ ایک اس لڑکی پر ہے جس کے والد صاحب اپنے بھتیجے سے اس کا بے جوڑ رشتہ کرتے ہیں اور بعد میں پچھتاتے ہیں حالانکہ وہ لڑکی اس کے بارے میں اپنی مرضی نہ ہونے کا واضح اظہار کر چکی ہوتی ہے۔ اس طرح طلاق ' وراثت اور دیگر مسائل اور مخلوط ماحول وغیرہ سب ہی مختلف انداز سے سامنے لائے گئے ہیں۔

کوئی کتب فروش اسے پاکستانی قارئین کے لیے فراہم کر سکے تو یہاں اس کا ایک بڑا حلقہ بن سکتا ہے۔ ہاں ' اگر مرتبین "باقی صفحہ فلاں" سے اپنے قارئین کو بچا سکیں تو بہتوں کا بھلا ہو گا۔ (م - س)

مولانا مودودی پر تنقیدوں کا جائزہ (دو حصے) ' محمد اشفاق حسین۔ ناشر: مجلس احیاے توحید و سنت ' حیدر آباد دکن۔ صفحات: حصہ اول ۲۲۰ ' دوم ۸۴ + ۲۴۔ قیمت: حصہ اول: ۲۵ روپے ' دوم ۳۵ روپے۔

مخالفین کے بارے میں مولانا مودودی کا رویہ اعراض و اغماض کا تھا۔ وہ مخالفت کے کانٹوں میں الجھے ہوئے دامن کو چھڑانے (پر وقت ضائع کرنے) کے بجائے اپنے دامن کا کچھ حصہ کانٹوں کے حوالے کر کے ' اپنے راستے پر گامزن رہنے کو ترجیح دیتے تھے مگر ان کے بعض مداح مخالفتوں کا جواب دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں وحید الدین خان صاحب مدیر "الرسالہ" اور صدر اسلامی مرکز نئی دہلی کی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر کی گئی ان تنقیدوں اور مخالفتوں کا جواب دیا گیا ہے جو ماہنامہ الرسالہ میں شائع ہوئی تھیں"۔ (مصنف)

مصنف نے مختلف عنوانات کے تحت "الرسالہ" کے اقتباسات درج کرنے کے بعد ' مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا دفاع کیا ہے۔ اشفاق صاحب نے "الرسالہ" کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد تفصیل اور گہرائی کے ساتھ خان صاحب کی تحریروں کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خان صاحب "اپنے خیالات موسمی لباس کی طرح بدلتے رہتے ہیں" اور "خان صاحب کا قلم اور ان کی صحافت ' اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ایک فتنہ عظیم اور شر کبیر ہے جس کے ساتھ صبر ' اعراض اور برداشت کا معاملہ نہیں کیا جا سکتا"۔ چنانچہ "وہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا دفاع کرنے پر مجبور ہیں"۔ کیونکہ مولانا اور جماعت کے ذریعے موجودہ زمانے میں "اسلام اور مسلمانوں کی قابل قدر اور لائق قدر خدمت ہو رہی ہے۔ اور فائدہ پہنچ رہا ہے۔ قرآن کی یہ ایک اہم تعلیم ' حلم اور ہدایت

ہے کہ ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ حق کی حفاظت اور مدافعت کرے اور اسے نقصان سے بچانے کی کوشش کرے"۔ اشفاق صاحب مزید لکھتے ہیں کہ انھیں اس سے پہلے "تبلیغی جماعت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور جمعیت العلما وغیرہ کی مدافعت کرنے اور ان پر کی گئی مولانا خان کی جاہلانہ اور جارحانہ تنقیدوں کا جواب دینے کی سعادت حاصل" ہوچکی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں سے محبت کا یہ جذبہ قابل قدر ہے، جس کے تحت مصنف نے اسلام کے لیے کام کرنے والے افراد اور جماعتوں کے دفاع کا بیڑا اٹھایا ہے تاہم دفاعی بحثوں میں مصنف کا انداز کہیں کہیں بہت تلخ ہوگیا ہے۔ خان صاحب نے مولانا مودودی پر جیسی بھی طنز و تعریض کی ہے اور وہ بقول مصنف: سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، ہمیشہ ہر جگہ اور ہر وقت مولانا مودودی، جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کے خلاف سوچتے رہتے ہیں، مگر اشفاق حسین صاحب کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ خان صاحب کو "جاہل، پاگل شخص" (ص ۳۲۸) کہیں یا ان کی باتوں کو "بکواس" (ص ۱۳۹) اور ان کے رویے کو "بد دماغی" (ص ۳۲۶) "کم ظرفی" (ص ۲۱۴) پر مبنی "کمینہ پن" (ص ۳۵۴) قرار دیں۔ (مصنف نے خان صاحب کی منفعت طلبی کا ذکر کیا ہے اور بھارتی سرکار کی حمایت اور اس سے مالی مفادات کے حصول کا الزام بھی لگایا ہے)۔ اسی طرح مصنف کے ہاں بعض باتوں کی تکرار کھٹکتی ہے۔ ہمارے خیال میں جو کچھ زیر نظر دو جلدوں میں بیان ہوا ہے، اسے سمیٹ کر قدرے مختصر انداز میں اور نسبتاً بہتر استدلال کے ساتھ بیان کیا جا سکتا تھا۔ اس نوع کے مخالفین کی ہر ہر سطر کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔

محمد اشفاق حسین سے گزارش ہے کہ وہ "مولانا وحید الدین خان کی فکری قلابازیاں سیریز" کے ضمن میں جو مزید کتابیں تالیف کر رہے ہیں، ان میں اختصار ملحوظ رکھیں تو بہتر ہوگا۔ (ر-ہ)

فی ظلال القرآن جلد سوم، سید قطب شہید، ترجمہ: سید معروف شاہ شیرازی، ناشر: ادارہ منشورات اسلامی، بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور، صفحات: ۱۱۹۶۔ ہدیہ: ۳۲۵ روپے۔

سید قطب شہید کی شہرۂ آفاق تفسیر کے اردو ترجمے کی تیسری جلد پیش نظر ہے۔ یہ حصہ پارہ ۹ تا ۱۲ کی سورہ الاعراف، الانفال، التوبہ، یونس، ہود اور یوسف کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل ہے۔

مولانا معروف شاہ شیرازی کے ترجمے کی پہلی دو جلدیں قبل ازیں شائع ہوچکی ہیں۔ پہلی جلد پر انھی صفحات میں مولانا عبدالمالک صاحب نے اپنے مفصل تبصرے (اکتوبر ۹۵) میں بتایا تھا کہ زیر نظر ترجمے میں تلخیص سے کام نہیں لیا گیا بلکہ پوری کتاب کا مکمل ترجمہ کیا گیا ہے۔ اصل کتاب کی طرح، ترجمے میں بھی پہلے ایک درس کی آیات دی گئی ہیں اور پھر ان کا سلیس اردو ترجمہ دیا گیا ہے۔ قرآنی

آیات جہاں کہیں بھی آئی ہیں، انھیں جلی قلم سے الگ لکھا گیا ہے"۔۔۔۔ زیر نظر جلد ۳ کا انداز و اسلوب بھی وہی ہے البتہ اس کی کتابت پہلے سے بہتر ہے۔ تشریحی حصے میں قرآنی آیات کے ساتھ آیات کا شمار نسخ (عربی) ہندسوں سے کیا گیا ہے۔ یہ شمار اردو ہندسوں سے ہو تو بہتر ہے۔

طباعت معیاری اور جلد عمدہ ہے۔ ایک مستحسن بات یہ ہے کہ ضخامت کے مقابلے میں ہدیہ نسبتاً کم ہے۔ (ر-ہ)

داعی اعظمؐ اور کثرت ازواج، پروفیسر سید محمد سلیم۔ ناشر: شہ تاج مطبوعات، ۱۰/۲۸ بیسمنٹ، بیسہ اخبار مرکز، اردو بازار لاہور۔ صفحات: ۸۲۔ قیمت: ۱۰ روپے۔

بعض مغربی مصنفین نے کثرتِ ازواج کے حوالے سے سیرت طیبہؐ پر چھینٹے اڑائے ہیں۔ پروفیسر محمد سلیم صاحب نے زیر نظر رسالے میں بڑے عالمانہ اور تحقیقی انداز میں مغربیوں کے اعتراضات کے جواب دیے ہیں، آپؐ کی کثیر زوجگی کے مصالح بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ حضورؐ کی خانگی زندگی (نعوذ باللہ) کسی دنیادار عیش پرست کی نہیں، بلکہ ایک خدا پرست زاہد کی زندگی تھی۔ آپؐ کی زندگی حسن معاشرت کا نمونہ تھی اور فی الحقیقت آپؐ طبقہ نسواں کے محسن اعظم ہیں۔ (ر-ہ)

عہد نبویؐ کا معاشرہ، قرآن کی روشنی میں: ڈاکٹر سید محمد لقمان اعظمی ندوی، ترجمہ: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی۔ ناشر: البدر پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، صفحات: ۷۰، قیمت: ۲۰۰ روپے۔

اولاً یہ کتاب دہلی سے شائع ہوئی تھی، جس پر شمارہ مئی میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اب لاہور سے اس کی عکسی اشاعت سامنے آئی ہے۔ دونوں اشاعتوں میں قیمت کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہے۔

۱: تبصرے کے لیے مطبوعات براہ راست مدیر "ترجمان القرآن" منصورہ لاہور-۵۴۵۷۰ کے پتے پر ارسال کیجیے۔

۲: ہر کتاب یا رسالے کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔

(مدیر)

مدیر کے نام

بادشاہ خان ' دیر

عقیدہ اور علم (مئی ۹۶) جیسے فلسفیانہ مضامین کے بجائے آپ اپنے صفحات عام فہم موضوعات پر سلیس زبان میں تحریرات کے لیے وقف کریں تو ہم جیسے قارئین زیادہ مستفید ہو سکیں گے۔ یہ تو میرے اوپر سے ہی گزر گیا۔

شہزاد چشتی ' کراچی

ہمارے پڑھے لکھے لوگوں میں امریکہ نوازوں کی کمی نہیں ہے۔ اسلامی تحریکات (مئی ۹۶) کے بارے میں نائب وزیر خارجہ کا معصومانہ اظہار خیال 'گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے۔ جب کہ امریکہ کا عمل تو کچھ اور ہی ہے۔ اچھا ہوتا کہ یہ بلاتبصرہ نہ ہوتا!

تیمیہ گوہر ' کراچی

اخبار میں پڑھا کہ سویڈن میں بچے کی ولادت پر ایک سال کی چھٹی دی جاتی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں خواتین کی شرائط ملازمت (ملازمت ' مائیں اور بچے 'مئی ۹۶) میں یہ گنجایش ہونا چاہیے کہ وہ ۵ ' ۷ برس بعد بھی ' اپنی ملازمت دوبارہ جوائن کر سکیں۔ اس سے ملازمت ترک کرنے کی شرح پر بھی خوش گوار اثرات ہوں گے

لطف الرحمان فاروقی ' اسلام آباد

خطوط مودودی ایک تاثراتی مطالعہ (مئی ۹۶) اردو میں مراسلاتی ادب پر ایک معلوماتی خزانہ ہے۔ سید مودودیؒ نے انگریزی اور عربی میں بھی خطوط لکھے ہیں۔ انھیں بھی سامنے آنا چاہیے۔ اس طرح کے مضامین کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے تاکہ نئی نسل تاریخ سے باخبر ہو۔

ڈاکٹر اے ایس کے غوری ' لاہور

عدالتی فیصلہ (مئی ۹۶) پر اشارات فصیح و بلیغ اور بار بار مطالعہ کے لائق ہیں۔

سید اشتیاق اظہر ' سینیٹر ' اسلام آباد

سپریم کورٹ کے فیصلہ پر آپ کے خیالات اور تجزیہ قابل پذیرائی ہیں۔ دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

احمد اللہ ' کوئٹہ

آپ کے جیسے پرچے میں ایک غلطی بھی کھٹکتی ہے۔ لیکن اس دفعہ تو طویل فہرست بنائی جا سکتی تھی۔ رادھاکرشنن کو بالالتزام کشن لکھنے سے تو صاحب مضمون کے بارے میں بھی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔

REGD. NO. L 5340

PHONES : 7587916
7585590

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE

